رضا علی عابدی

جان صاحب

کہانیاں

جان صاحب

کہانیاں

رضا علی عابدی

سنگِ میل پبلی کیشنز ○ لاہور

891.4393 Raza Ali Aabdi
Jan Sahib / Raza Ali Aabdi.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications,
2009.
111pp.
1. Urdu Literature - Short Stories.
I. Title.

2009
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-1032-1
ISBN-13: 978-969-35-1032-4

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), Lahore-54000 PAKISTAN
Phones: 37220100-37228143 Fax: 37245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

ماہ طلعت کے نام

"اگر عیسیٰ خدا کے بیٹے ہوتے
تو ان کے بعد کبھی کسی کے
جوان بیٹے کو موت نہ آتی"

میر صاحب کا پاگل پن

کہانیاں

ایک قطار کی کہانی

لمبی قطار دیکھ کر میں ٹھٹھک گیا۔ اف میرے خدا، اتنی لمبی قطار؟ یہ اتنے بہت سے لوگ کہاں سے آ گئے؟ کیوں آ گئے؟ کیا ان سب کو آج ہی آنا تھا؟ کیا آنے کے لئے کوئی اَور دن نہیں بچا تھا؟ کیا انہیں اتنی بڑی دنیا میں کوئی اَور کام نہیں تھا؟ میں یہ سوچتا گیا اور قطار کے آخری سرے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

وہ جو ٹکٹ گھر کی کھڑکی سے لگا کھڑا تھا، مسلسل گا رہا تھا اور کھڑکی کے نچلے تختے پر طبلہ بجاتا جا رہا تھا۔ وہ جو اس کے پیچھے کھڑا تھا، اُس نے اپنی ٹوپی ذرا سی ترچھی کر لی تھی اور آگے والا جب گاتے گاتے رُک جاتا تو پیچھے والا اپنے منہ سے ساز بجانے لگتا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ایک ایک ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور ذرا ذرا دیر بعد ایک ہی کنگھے سے دونوں اپنے بال درست کرتے تھے۔

ان کے پیچھے کھڑا تیسرا آدمی مسکرائے جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ بلا سبب مسکرا رہا ہے مگر پھر خیال آیا کہ کچھ سبب تو ہو گا۔

چوتھے آدمی نے گلے میں سرخ رومال باندھ رکھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ رومال کھولتا، اس سے اپنے چہرے پر پنکھا جھلتا اور رومال

دوبارہ باندھتا اور سامنے والے فلیٹ کی بالکنی میں کھڑی لڑکی کو اس ادا سے دیکھتا جیسے وہ ابھی اُتر کر آئے گی اور آکر اس سے کہے گی کہ یہاں تپتی دھوپ میں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ میرے ٹھنڈے ٹھنڈے فلیٹ میں چلو۔ اور وہ آگے کھڑے ہوئے تین آدمیوں کو ناز و ادا سے، اور پیچھے کھڑے ہوئے تیس آدمیوں کو حقارت سے دیکھتا ہوا لڑکی کا ہاتھ تھامے چلا جائے گا۔

پانچواں شخص دھوپ کا چشمہ لگا کر آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ سب کو دیکھ رہا ہے اور اُسے کوئی نہیں دیکھ رہا ہے لہٰذا وہ اپنے بدن کو جہاں تہاں کھجائے جا رہا تھا اور کچھ تو اس کھجانے کی لذت سے خوش تھا اور کچھ اس خیال سے کہ اُسے ٹکٹ ضرور ملے گا۔

اس کے پیچھے جو شخص کھڑا تھا اُسے میں نے پہلے بھی کہیں دیکھا تھا۔ غالباً یہ راشن کارڈ بنانے والا وہی کلرک تھا جو بائیں ہاتھ سے لکھا کرتا تھا اور دفتر میں ہمیشہ جوتے اتار کر بیٹھتا تھا، راشن کارڈ بنوانے والوں کی قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں کو دھتکارا کرتا تھا مگر اُس روز خود قطار میں کھڑا تھا اور بڑا مسرور نظر آتا تھا کہ وہ چھٹے نمبر پر کھڑا ہے۔

جو لوگ قطار کے درمیان تھے، اُن کے بارے میں طے کرنا مشکل تھا کہ کیا سوچ رہے تھے۔ کچھ گنگنا رہے تھے۔ کچھ گھر سے چلغوزے لے آئے تھے، کچھ کھڑے ربڑ کی چپلوں کے فائدوں اور نقصانات پر بحث کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا کہ انہیں پہنے پہنے چاہو تو نہر میں اتر جاؤ، چاہے مندر میں چلے جاؤ۔ دوسرے کا اصرار تھا کہ پیروں میں پسینہ بہت آتا ہے۔ تیسرا خدا جانے کہاں سے سن کر آیا تھا کہ ربڑ کی چپلیں پہننے سے بینائی تیز ہوتی ہے۔ چوتھا اِن چپلوں کا سخت مخالف تھا کیونکہ وہ ایک روز ایسی ہی چپلیں

پہن کر اپنی محبوبہ سے ملنے چلا گیا تھا تو اُس نے بات کرنے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ ربڑ کی چپلیں پہنے ہو تو وہ اپنے شوہر کو بھی قریب نہیں آنے دیتی۔

ان لوگوں کے پیچھے بزرگوں کی ایک ٹولی کھڑی تھی۔ کپڑے سے رگڑ رگڑ کر صاف کرتے کرتے ان کے چشموں کے شیشے دھندلا گئے تھے۔ ان سب نے جوتوں کے پچھلے حصّے کو ایڑیوں سے دبا دبا کر چپل بنالیا تھا اور پتلونوں میں نیفے ڈلوا کر انہیں ازار بندوں سے باندھ رکھا تھا۔ بال رنگوائے ہوئے عرصہ گزر چکا تھا اور بالوں کی جڑیں سفید سے بھی زیادہ سفید نظر آتی تھیں۔ ان سب کی پان کی ڈبیوں کی قلعی اُڑ چکی تھی اور ان میں سے کسی کو غرض نہیں تھی کہ سامنے والے فلیٹ کی بالکنی میں کھڑی ہوئی لڑکی نے کتنی اونچی اسکرٹ پہن رکھی ہے اور یہ کہ اس کی پنڈلیاں جتنی سیاہ ہیں، رانیں اُتنی کالی نہیں۔

بزرگوں سے پیچھے جو لوگ کھڑے تھے ان کا کام ذرا مشکل تھا۔ وہ بار بار گردنیں نکال نکال کر اپنے سے آگے کھڑے ہوئے لوگوں کو گن رہے تھے۔ خدا جانے وہ بار بار کیوں گنتے تھے۔ شاید انہیں خیال تھا کہ ان کی آنکھ بچے گی تو کچھ اَور نئے لوگ خاموشی سے آ کر ان سے آگے کھڑے ہو جائیں گے۔ ان کی گردنیں لمبی ہوئی جا رہی تھیں اور بہت زیادہ دھیان دیتے دیتے آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔ شاید یہ لوگ ٹکٹ پانے اور محروم رہ جانے والوں کی درمیانی سرحد پر کھڑے تھے۔ ان کا حال سُنار کے ترازو جیسا تھا کہ ایک پلڑے میں سوکھا پتّہ بھی گرے تو ترازو جھک جائے۔

آخر ان کی چوکسی کام آئی۔ لال رومال والے کا کوئی دوست کہیں

سے آکر اُس سے باتیں کرنے لگا اور باتیں کرتے کرتے اور سر کتے سر کتے قریب تھا کہ قطار میں شامل ہو جائے کہ پوری ٹولی چلائی۔ اتنے بہت سے لوگ ایک ساتھ بولے تو محض چند لفظ سمجھ میں آئے: ابے۔ بے ایمان۔ کہاں سے۔ سالے اور تیری۔

رومال والے کا دوست گھبرا کر قطار سے نکل گیا اور سٹپٹا کر لپکا۔ مجھے اس پر کچھ ترس آیا اور کچھ پیار بھی آیا۔ شاید اس خیال سے کہ وہ اب جھینپتا ہوا آئے گا اور قطار کے آخر میں میرے پیچھے کھڑا ہو جائے گا۔ مگر اس نے مجھے یوں دیکھا جیسے دیکھ نہ رہا ہو۔ لپک کر سائیکل رکشا رکوایا۔ اُس میں بیٹھا اور چلا گیا۔

اُس ٹولی سے پیچھے جو لوگ کھڑے تھے ان کا کام آسان تھا۔ وہ بار بار اپنے سے پیچھے والوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ میں نے بہت سوچا۔ اپنی عقل پر بہت زور دیا۔ جتنے اسباب ہو سکتے تھے، ایک ایک کر کے ہر ایک پر دماغ سوزی کی پر سمجھ میں نہ آیا کہ یہ اپنے سے پیچھے والوں کو کیوں دیکھ رہے ہیں۔ بہت سوچا مگر میں کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ غور کر کر کے میں نے اپنا بُرا حال کر لیا۔ میں نڈھال ہو گیا اور میرے سارے اعضا شل ہونے لگے۔ بازووں کا درد اُتر کر ہتھیلیوں میں آ گیا۔ دل کی دھڑکن اپنے ہی کانوں میں سنائی دینے لگی اور کنپٹیوں کی تپک آنکھوں میں دکھائی دینے لگی۔ یہ لوگ پیچھے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ یہ سوال میرے کاسۂ سر کے اندر یوں گونجنے لگا جیسے مصر کے اہرام کھو کھلے ہو جائیں اور فرعونوں کی میّتیں مڑ مڑ کر پیچھے دیکھنے لگیں۔

آج بہت عرصے بعد سمجھ میں آیا ہے کہ میں یہ سب کچھ سوچ کر

کوئی دوسری سوچ مٹانا چاہ رہا تھا۔ خود میں نے بھی کئی بار مڑ کر پیچھے دیکھا تھا اور دیکھا تھا کہ اب قطار میں کوئی بھی نیا آدمی نہیں آرہا ہے۔ بہت دیر سے کھڑا آخری آدمی میں ہی ہوں اور مایوسی میں میرا ساجھے دار شاید کوئی نہیں۔

میر صاحب کا پاگل پن

میر جعفر علی بلگرامی کے پاگل قرار دیئے جانے کا قصہ بھی خوب ہے۔

پرانی نمائش کے گول چوراہے کے سامنے ہندوؤں کے زمانے کی دو عالی شان کوٹھیاں تھیں جن کے آگے گل مہر کے دو پرانے درخت لگے ہوئے تھے۔ سال بھر تو یہ درخت یوں ہی کھڑے رہتے البتہ موسم بہار کے آتے ہی ان پر جب سیندوری پھول کھلتے تو علاقے کی ہوا کا رنگ سیندور جیسا ہو جاتا۔ راہ چلتے لوگ رک کر دیر تک رنگوں کا یہ آبشار دیکھا کرتے تھے۔ موٹر گاڑیاں ڈرائیوروں کی بے دھیانی کی وجہ سے ٹکرا جایا کرتی تھیں اور بعض لوگ تو دور دور سے بسوں میں بیٹھ کر صرف ان دو درختوں کو دیکھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔

اُن ہی لوگوں میں میر جعفر علی بلگرامی بھی تھے۔ ایک سال وہ گل مہر کے درختوں پر لدے ہوئے پھول دیکھنے گئے۔ اس سال پھول اتنی کثرت سے آئے کہ شہد کی مکھیاں بھی اچھی طرح چھک کر بیٹھ رہیں اور فالتو رس نیچے سڑک پر ٹپکنے لگا۔

میر صاحب نے دور سے درختوں کے جوبن کا یہ حال دیکھا تو لپکتے

ہوئے گئے اور درختوں کے تنوں سے لپٹ کر انہیں چومنے لگے۔

کسی نے کہا۔ "ہائیں ہائیں۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

کہنے لگے۔ "تم تاج کو داد دے رہے ہو، میں بادشاہ کو"۔

اس پر ایک قہقہہ پڑا اور یوں میر جعفر علی بلگرامی پاگل قرار دے دیئے گئے۔

ایک روز محلے کے لڑکوں کو سمجھا رہے تھے۔ "دیکھو۔ ہمیں جو کچھ ملتا ہے، زمین سے پھوٹتا ہے یا آسمان سے برستا ہے۔ اسی لئے ہم سجدہ کرتے ہیں تو زمین پر ماتھا ٹیکتے ہیں یا دعا مانگتے ہیں تو آسمان کی طرف ہاتھ پھیلاتے ہیں"۔ یہ سن کر لڑکے انہیں پتھر مارنے چلے۔ محلے کے دکان داروں نے بڑی مشکل سے بچایا۔

ان کے دونوں بیٹے بائیسکل پر بیٹھ کر دفتر جاتے تھے اور شام کو تھکے ہارے آتے تھے اور کھانا کھاتے ہی سو جاتے تھے۔ میر صاحب کی ساری گفتگو دونوں بیٹیوں سے ہوا کرتی تھی۔ ان سے بس یہی کہا کرتے تھے کہ تمہاری آنکھوں کے پپوٹے اور ناک کے نتھنے بالکل تمہاری ماں جیسے ہیں۔ بیٹیاں ماں کی تصویر اور گھر کا آئینہ دیکھنے کے بجائے ایک دوسرے کو دیکھ کر اور منہ میں دوپٹہ ٹھونس کر ہنسا کرتی تھیں۔ کبھی وہ اس طرح کی باتیں بھائیوں کو بتاتیں تو بھائی انگشتِ شہادت کنپٹی کے قریب لے جا کر یوں گھمایا کرتے تھے جیسے سفید ہوتی ہوئی قلموں پر دائرے بنا رہے ہوں۔

ایک روز کچھ عیسائی تبلیغ کرتے ہوئے ان کے دروازے پر آگئے اور کہنے لگے کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے تھے۔ یہ سننا تھا کہ میر صاحب آگ بگولا ہو گئے اور بولے۔ "عیسیٰ جوان موت مرے۔ اگر وہ خدا کے بیٹے

ہوتے اور اس پر یہ صدمہ گزرتا تو اس کے بعد کبھی کسی کے جوان بیٹے کو موت نہ آتی"۔ پادریوں نے یہ بات سن کر کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے چلے گئے۔

اُن کو پاگل کہنے والے اس وقت بہت محظوظ ہوتے جب میر صاحب کہتے کہ دیکھو، کبھی کسی کے ساتھ نیکی نہ کرنا۔

کبھی کبھی لوگ اُنہیں چھیڑنے کے لئے ان سے پوچھتے۔" میر صاحب، کبھی کسی کے ساتھ کیا نہ کرنا؟"۔

جواب ملتا۔ "نیکی"۔

ایک بار کسی نے مسجد میں ان کے جوتے چرالئے۔ یہ کہتے ہوئے ننگے پاؤں لوٹ آئے کہ خدا کا شکر ہے چور کے دونوں پاؤں سلامت ہیں۔

ایک روز کسی چیز سے ٹکرا کر گرے اور گرتے ہوئے یا علی، یا علی چلائے۔ لوگوں نے مذاق اڑایا کہ دیکھئے مولا آپ کی مدد کو نہیں آئے۔

بہت خفا ہوئے اور کہنے لگے کہ سر سلامت اور ہڈی پسلی ثابت ہے، مولا نے نہیں بچایا تو کیا تمہارے سسرے نے بچایا۔

لوگ خوب ہنسے۔

ایک رات دیر تک گنگناتے رہے۔ "یاد نہ کر دلِ حزیں بھولی ہوئی کہانیاں"۔ اگلی صبح بیٹوں نے پاگل خانے بھجوادیا۔ تیسرے ہی روز ڈاکٹروں نے واپس گھر بھیج دیا کیوں کہ یہ وہاں ہر ایک سے کہتے پھر رہے تھے کہ باہر کی دنیا سے تو یہ پاگل خانہ اچھا، کیوں کہ یہاں رہنے والے مانتے تو ہیں کہ وہ پاگل ہیں۔

ایک دن محلے میں ٹولی بنا کر بے کار گھومنے والے لڑکوں نے ان سے پوچھ لیا۔ ''میر صاحب۔ سنا ہے تم پاگل ہو''۔

بولے۔ ''کون کہتا ہے؟''

لڑکوں نے کہا۔ ''لوگ کہتے ہیں۔''

کہنے لگے۔ ''ڈھونڈتا پھرتا ہوں کہ کوئی ہوش مند ملے جس سے فیصلہ کراؤں کہ اصل میں پاگل کون ہے، مگر ملتا ہی نہیں''۔

ایک دوپہر چھوٹا پوتا اسکول سے لوٹ کر آیا اور گھر میں داخل ہوتے ہی بولا۔ ''دادا ابّا، سب کہتے ہیں کہ آپ پاگل ہیں، کیا آپ سچ مچ پاگل ہیں؟''

کہنے لگے۔ ''ہاں بیٹا، لالوکھیت میں رہتا ہوں اس لئے لوگ کہتے ہیں کہ پاگل ہو گیا۔ سوسائٹی میں رہتا تو لوگ کہتے: نروس بریک ڈاؤن ہو گیا ہے''۔

آخر ایک روز بریک ڈاؤن کی گھڑی آ پہنچی۔ باہر سے آئے، شیروانی اتاری اور خاموشی سے لیٹ گئے۔ بیٹیاں قریب بیٹھی سورۂ یاسین پڑھ رہی تھیں کہ چھوٹا پوتا اسکول سے لوٹ کر آیا اور گھر میں داخل ہوتے ہی بولا۔ ''دادا ابّا، آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ کبھی کسی کے ساتھ نیکی نہ کرنا''۔

اپنا ہاتھ اس کے سر پر پھیر کر اور جمے جمائے بالوں کو اچھی طرح بگاڑ کر بولے۔ ''کسی کے ساتھ نیکی کرو گے تو جواب میں اُس سے بھی نیکی کی امّید رکھو گے۔ وہ کرے گا نہیں تو نیکی پر سے تمہارا ایمان اُٹھ جائے گا''۔

یہ کہا اور خود دنیا سے اٹھ گئے۔

میرا بچّہ

رزّاق کو جب کہیں نوکری نہیں ملی اور ہر دروازے سے اُسے خالی ہاتھ لوٹنا پڑا تو ایک عجب بات ہوئی۔ وہ درد جو اس کے سر کے دائیں حصّے میں رہتا تھا، وہ بائیں جانب رہنے لگا۔ درد کی اس کروٹ سے اَور تو کچھ نہیں ہوا البتہ اس نے محسوس کیا کہ اُس کے ذہن مین نئی طرح کے خیال آنے لگے ہیں، پہلے سے مختلف تو نہیں لیکن پہلے سے زیادہ یقین کے ساتھ۔

اُسے محسوس ہوا کہ ہر جگہ نوکری سے جو انکار کیا جارہا ہے اس کا بس ایک ہی سبب ہو سکتا ہے۔ یہی کہ اس کا دایاں ہاتھ ذرا سا ٹیڑھا ہے اور دایاں پیر تھوڑا سا مڑا ہوا ہے۔ لیکن وہ خود حیران تھا کہ اس کا انکار سے کیا تعلق۔ وہ آسانی سے لکھ لیتا ہے، ایک ذرا سا ترچھا قلم پکڑتا ہے مگر اس سے کسی کو کیا۔ اور چلنے میں بھی اسے کوئی ایسی بڑی دشواری تو نہیں ہوتی۔ معمولی سا لنگ ہے تو وہ تو تیمور جیسے بادشاہ کی ٹانگ میں بھی تھا۔ اُسے تو کبھی کہیں سے انکار نہیں ہوا ہو گا، یہاں تک کہ دینے والوں نے اٹھا کر بادشاہت دے دی۔

رزاق حیران تھا کہ اپنی ان باتوں پر بہت ہنسے یا کم ہنسے۔ اُسے ہنسی آئی بھی تو اپنی باتوں پر نہیں بلکہ تنہائی میں ہنسنے پر۔ یوں بھی وہ بہت دنوں سے کسی کے ساتھ نہیں ہنسا تھا۔

اسے یقین تھا کہ ملازمتوں سے انکار کا اس کے ذرا سے ٹیڑھے ہاتھ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اس نے جھک کر اپنے پیروں کو دیکھا۔ بس ایک پیر تھوڑا سا مڑا ہوا تھا جس سے ایڑی کم اور جوتے کا پہلو زیادہ گھستا تھا۔

شہر کی فاؤنڈری سے بھی انکار ہو گیا تو وہ سر جھکائے واپس چلا آیا۔ راستے میں قاسم جراح کی بیٹھک پر رکا اور قاسم سے یہ کہتے کہتے رہ گیا کہ کسی طرح میری ٹانگ سیدھی ہو سکتی ہے؟ ہاتھ کا یہ خم نکل سکتا ہے؟ اس نے سوچا کہ قاسم جراح نے بھی انکار کر دیا تو کیا ہو گا۔ اسے صاف محسوس ہوا کہ اب اَور انکار سننے کی اس میں سکت نہیں رہی۔

رزاق زینہ اتر کر کمپنی باغ میں چلا گیا اور سوکھے پڑے ہوئے فوارے کی مینڈھ پر بیٹھ کر اپنا دھیان ہٹانے کے جتن کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ کچھ اَور سوچے۔ کسی اَور طرح کی سوچ ذرا دیر کے لئے پانی بن کر فوارے سے ابل پڑے اور اسے شرابور کر دے۔

ہوا میں اڑ کر پانی تو نہیں آیا البتہ کہیں سے کسی کی آواز آئی۔ ”بھیک مانگا کر، میرا بچہ“۔

رزاق نے جلدی جلدی پلٹ پلٹ کر اِدھر اُدھر دیکھا مگر وہاں تو دور دور تک کوئی نہ تھا۔ پھر یہ بھیک مانگنے کا مشورہ کس نے دیا؟ اس کا ذہن یہی سوال بار بار دُہرا رہا تھا کہ اچانک ذہن نے سوال چھوڑ کر جواب دینا شروع کر دیا۔ ”ٹھیک تو ہے۔ جب کوئی کام نہیں ملتا تو مانگ کر دیکھو، شاید خیرات مل جائے“۔

اُسے یاد آیا کہ مچھّی محلّے کی جامع مسجد کے مولوی صاحب ہمیشہ نمازیوں کو تلقین کیا کرتے ہیں کہ خیرات دیا کرو۔ رزاق نے سوچا کہ اتنے

بہت سے نمازی خیرات دینے پر آمادہ ہوں گے تو اُنہیں خیرات مانگنے والوں کی ضرورت بھی تو ہو گی۔

دسویں جماعت کے امتحان کی تیاری کرتے ہوئے اس نے معاشیات کی کتاب میں طلب اور رسد کا قانون پڑھا تھا۔ اس میں کچھ یہی لکھا تھا کہ طلب ہو تو رسد بھی ہوتی ہے۔

تو پھر کیا کیا جائے ؟ پھر وہی آواز آئی۔ "دستِ طلب دراز کر میرا بچہ"۔

اچانک اس کے اندر ہمت اور جرات سے ملتی جلتی کوئی شے بیدار ہوئی اور اس نے خود سے کہا اور بڑے اعتماد سے کہا۔ "چلو کیوں نہ آزما کر دیکھا جائے۔ دیکھیں بھیک مانگنے پر کیا ملتا ہے"۔

وہ کمپنی باغ سے نکل کر باہر آرہا تھا تو خود بخود اس کا مڑا ہوا ہاتھ اَور مڑ گیا اور ٹیڑھی ٹانگ پر وہ پہلے سے زیادہ لنگڑانے لگا۔ سیڑھیاں چڑھ کر وہ بازار میں آیا اور پہلے ہی راہ گیر کے آگے ہاتھ پھیلا کر بولا کہ صبح سے بھوکا ہوں۔

راہ گیر تڑخ کر بولا۔ "پھر میں کیا کروں؟"

"ایک وقت کی روٹی کھلا دیجئے جناب"۔

راہ گیر نے بڑی زحمت کر کے اپنی موٹی سے گردن ہلائی اور بولا۔ "اچھے خاصے تگڑے ہو۔ بھیک مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ جا کر کوئی نوکری کیوں نہیں کرتے"۔

"کوئی نوکری ہی دلا دیجئے جناب"۔ رزاق کے لہجے میں طلب کا انداز پیدا ہونا تھا کہ رسد کے دروازے دھڑام سے بند ہو گئے۔ راہ گیر نے

موٹی سی گالی دی اور آگے بڑھ گیا۔

پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ اتنی موٹی گالی سن کر رزاق کو کئی روز تک کسی کے آگے دستِ طلب دراز کرنے کی جرات نہ ہوتی لیکن یہ ہوا کہ اگلے ہی لمحے، اگلے ہی راہ گیر کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے وہ بولا۔ "کچھ دے دیجئے، اُس کے ----اللہ کے نام پر"۔

راہ گیر نے اسے غور سے دیکھا اور پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے صرف اونہوں کہا اور آگے بڑھ گیا۔

رزاق لاری کے اڈّے پر جا پہنچا۔ ایک مسافر جیب سے سکّہ نکال کر دینے ہی والا تھا کہ اس کا ارادہ بدل گیا اور خیرات دینے کے بجائے اس نے اسی سکّے سے ایک سگریٹ خریدی، جلتی ہوئی رسّی کے سلگتے ہوئے سرے سے سگریٹ سلگا کر وہ بھی چلتا بنا۔

رزاق نے اگلے روز بڑے بازار کا پھیرا لگایا۔ اس کے بعد سبزی منڈی کے چکّر کاٹے، مچھلی بازار گیا، گھاٹ پر ہاتھ پھیلائے کھڑا رہا، اسپتال کے سامنے دن بھر بیٹھا رہا۔ سوت کاتنے والوں سے، گُڑ بنانے والوں سے، چاندی کے ورق کوٹنے والوں سے اور نہر کے کنارے چاٹ بیچنے اور کھانے والوں سے، اس نے ہر ایک سے خیرات مانگنی چاہی، جہاں جہاں اسے امید تھی کہ ایک آدھ ٹکا مل جائے گا، اسے ٹکا سا جواب ملا۔

ایک روز وہ تھک کر بیٹھ گیا اور کچھ سوچ کر مسکرایا۔ اس نے سوچا کہ انکار سننے کی مجھے کتنی عادت ہو گئی ہے۔ نہ میرا دل ٹوٹتا ہے، نے میری آس۔ بس ایک چیز ہے جو دل سے قریب ہے تو دل کو بہت دکھاتی ہے اور وہ ہے اس کی قمیص کی خالی جیب۔ دوسرے لوگوں کو اس نے دیکھا کہ ان کی

جیبیں بہت میلی تھیں، شاید اس لئے کہ وہ جیبوں کو استعمال کرتے تھے۔

وہ سوچنے لگا کہ یہ کیسے لوگ ہیں کہ اس کی حالت کو نہیں سمجھتے۔ نہ اس پر ترس کھاتے ہیں نہ اس کے ٹیڑھے ہاتھ اور مڑے ہوئے پیر پر۔ یہاں تک کہ مولوی صاحب کی تلقین اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو بھی بھلا بیٹھے ہیں ورنہ کیا بات ہے جو انہیں خیرات دینے سے روک رہی ہے۔

عین اسی وقت کہیں سے آواز آئی جس نے اُس کا کہا ہوا جملہ جوں کا توں دہرایا۔ ”کیا بات ہے جو انہیں خیرات دینے سے روک رہی ہے؟“

رزاق کو محسوس ہوا کہ پیچھے کھڑا ہوا کوئی شخص اس کا شانہ تھپتھپا رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہاں ایک فقیر کھڑا تھا۔ ہاتھ میں المونیم کا ٹھکا پٹا پیالہ لئے ایک میلا کچیلا فقیر، جس کا نہ ہاتھ ٹیڑھا تھا اور نہ ٹانگ مڑی ہوئی تھی لیکن اس کے پیالے میں کئی سکّے پڑے ہوئے تھے۔

فقیر کی آنکھوں سے آنکھیں چار ہوئیں تو رزاق نے عرصے بعد شفقت دیکھی۔ انکار سننے کے عادت تو اسے تھی، شفقت دیکھنے کا یہ تجربہ بالکل نیا تھا۔

فقیر بولا۔ ”کیا بات ہے میرا بچہ؟“

”کچھ بھی نہیں“۔

”نہیں، بات ضرور ہے“۔ فقیر نے کہا۔ ”بھیک مانگ رہے ہو مگر کوئی دیتا نہیں، یہی بات ہے نا؟“

رزاق نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر وہ تھوک کا بڑا سا گھونٹ نگل کر رہ گیا۔ فقیر بولا۔ ”کتنے دن ہوئے بھیک مانگتے؟“

”پانچ ---- نہیں، چھ“۔

"لیکن کسی نے کچھ نہیں دیا؟"

"نہیں"۔

فقیر نے اسے اپنے پاس بٹھالیا اور اس کے کان کے قریب منہ لاکر بولا۔ "تم بھی بڑے بھولے ہو۔ اتنا بھی نہیں جانتے کہ بھکاری کو اس کی اپنی بستی میں کوئی بھیک نہیں دیتا"۔

رزاق نے حیرت سے اسے دیکھا۔ اس نے اپنا فقرہ دہرایا۔ "فقیر کو اس کی اپنی بستی میں بھیک نہیں ملا کرتی، میرا بچہ۔ کل صبح ہوتے ہی لاری میں بیٹھ کر میری بستی میں چلے جانا۔ وہاں ملے گی خیرات"۔

رزاق نے کہا۔ "مگر لاری کا کرایہ کہاں سے آئے گا؟"

فقیر نے اپنے پیالے سے کچھ سکے نکال کر دیئے۔ "یہ لو، چھ آنے لاری کا کرایہ اور کچھ پیسے ایک پیالے میں ڈال کر وہ پیالہ آگے بڑھاؤ گے تو اس میں اَور پیسے آئیں گے"۔

رزاق نے اپنا سر یوں ہلایا جیسے کوئی اونگھتا ہوا شخص خود کو جگا رہا ہو۔ فقیر بولا۔ "خالی پیالے میں کبھی کوئی پیسہ نہیں ڈالتا۔ اس میں کچھ پیسے بھر لینا۔ پھر دیکھنا کیا ہوگا۔"

رزاق اچانک ایک چھوٹا سا، بھولا سا لڑکا بن گیا اور بولا۔ "کیا ہوگا؟"

"پیسے کو پیسہ کھینچے گا----"

اور دونوں ایک ساتھ بولے۔ "---میرا بچّہ"۔

بہت دنوں بعد رزاق کسی کے ساتھ مل کر ہنسا۔

حرامی مداری

تقریر جاری تھی۔

"وہ ایک خاص قسم کا ہرن ہوتا ہے۔ اس کے سینگ نہیں ہوتے۔ گردن پر دو سفید دھاریاں ہوتی ہیں جو آکر سینے پر مل جاتی ہیں۔ صرف سنبل کی گھاس کھاتا ہے، اور سبزہ زار میں اس شان سے داخل ہوتا ہے کہ ہرنیاں اُسے دیکھ کر دم بخود رہ جاتی ہیں، اور وہ خود آنکھ اٹھا کر بھی ہرنیوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ بس منظر یہ ہوتا ہے کہ آگے آگے وہ اور پیچھے پیچھے ہرنیوں کا غول۔ وہ چاہتی ہیں کہ ایسے نر پر قربان ہو جائیں مگر نر کسی کو خاطر میں نہیں لاتا کیوں کہ خاطر میں لانے کی گھڑی ابھی دور ہے۔"

مجمع دَم سادھے تقریر سن رہا تھا۔

"آخر وہ رات آتی ہے جس رات پورا چاند چڑھتا ہے اور جس وقت شبنم سے بھیگ کر سنبل مہک رہی ہوتی ہے اُس وقت بغیر سینگوں والا نر ایک انگڑائی لیتا ہے، بہت زور کی انگڑائی۔"

پھر کیا ہوتا ہے --- پھر کیا ہوتا ہے۔ سارا مجمع دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

"پھر یہ ہوتا ہے کہ نر کی ناف کلی کی طرح چٹکتی ہے اور ناف کے

اندر محفوظ مُشک مہکتی ہے۔ اس میں سے خوش بو پھوٹنی شروع ہوتی ہے۔ اتنی میٹھی اور اتنی بھینی خوش بو کہ خود ہرن مست ہو جاتا ہے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا ہے اور ---اور---"

یہاں پہنچ کر اس کی تقریر رک گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر کہہ نہ سکا۔ وہ رٹی رٹائی تقریر سے ہٹ کر کچھ نئے لفظ ڈھونڈنے لگا مگر وہ نہ مل سکے اور وہ ہکلانے لگا۔ سبب اس کا یہ تھا کہ دائرے کی شکل میں کھڑا ہوا مجمع تو ویسا ہی تھا جیسا کہ ہوا کرتا ہے مگر مجمع کے آگے بیٹھے ہوئے لڑکوں کے بیچوں بیچ بیٹھا ہوا لڑکا ویسا نہیں تھا۔

نہائے دھوئے، بال اچھی طرح جمائے، ذرا سی ملگجی قمیص اور اُتنا ہی ملگجا پاجامہ اور پیروں میں باٹا کی چپل پہنے وہ دوا فروش کی تقریر اتنے دھیان سے سن رہا تھا کہ کئی بار دوا فروش اپنی تقریر بھول گیا۔ لڑکے کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں بلا کی ذہانت تھی۔

خود کو سنبھال کر دوا فروش نے اپنی تقریر آگے بڑھائی۔

"ہرن کی ناف سے خوش بو کی لپٹیں اٹھتی ہیں۔ ہرن مست ہو جاتا ہے۔ یہاں تک تو غنیمت ہے مگر غضب اس وقت ہوتا ہے جب مشک کی یہ مہک ہرنیوں تک پہنچتی ہے۔ وہ زور زور سے ہوا کو سونگھتی ہیں اور جھٹ جان جاتی ہیں کہ خوش بو کدھر سے آ رہی ہے۔ بس پھر وہ اسی جانب دوڑ پڑتی ہیں۔"

تقریر جاری تھی۔ دوا فروش کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے لڑکا اُس کا ایک ایک لفظ کہیں محفوظ کر رہا تھا۔

"ہاں تو سارا جنگل مہکنے لگتا ہے۔ دور دور سے مادائیں نر کی طرف

چل پڑتی ہیں۔ خود نر تو مست ہوتا ہی ہے لیکن جو مستی ماداؤں پر طاری ہوتی ہے"---وہ رکا اور بولا "اُسے بیان کرنا مشکل ہے۔"

یہاں سے تقریر کا رخ بدلا۔ سامنے بیٹھے ہوئے لڑکے نے پہلو بدلا۔

"بس چڑھتے چاند کی رات کا وہی لمحہ ہوتا ہے جس کا شکاری کو انتظار ہوتا ہے۔ مشک کی خوش بو اس کی ناک میں پہنچتی ہے اور خوش بو کے ساتھ چلتا چلتا شکاری بھی اُس جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں سبزہ زار کے بیچوں بیچ ہرن کھڑا ہوتا ہے اور مادائیں دیوانہ وار اس کے چکر کاٹ رہی ہوتی ہیں۔ شکاری چپکے چپکے چلتا ہوا قریب پہنچتا ہے، کاندھے سے بندوق اتارتا ہے، نشانہ باندھتا ہے اور جنگل کے سناٹے میں ایک تڑاخا ہوتا ہے۔ ہرن وہیں گر پڑتا ہے۔ ہرنیاں روتی ہوئی، بین کرتی ہوئی، جھاڑیوں میں گم ہو جاتی ہیں۔ شکاری دوڑتا ہوا ہرن کے قریب پہنچتا ہے۔ اُس وقت دم توڑتا ہوا ہرن آخری بار حسرت سے آنکھیں اُٹھا کر شکاری کے چہرے کو دیکھتا ہے۔ دیکھنے کے اسی انداز کو غزل کہتے ہیں۔"

مجمع میں کھڑے ہوئے دو تین آدمیوں نے واہ وا کہہ کر داد دی۔

"تو حضرات، وہ شکاری میں ہی ہوں۔ جان پر کھیل کر نیپال کے جنگلوں میں جاتا ہوں۔ مارا مارا پھرتا ہوں۔ دو دو تین تین سال ٹکریں مارتا ہوں تب کہیں مشک والا ہرن ہاتھ لگتا ہے۔ اس کی ناف کھولتا ہوں تو پتہ ہے اُس کے اندر سے کیا نکلتا ہے؟"

سارا مجمع بولا۔ "کیا؟"

لڑکا خاموش رہا۔

یہاں پہنچ کر دوا فروش نے ایک پٹاری کھولی۔ اس کے اندر سے روپہلے ٹین کی ایک ڈبیا نکالی جس کے اوپر آئینہ لگا ہوا تھا۔ پھر وہ ڈبیا کھولی۔ مجمع پنجوں پر اٹھ اٹھ کر ڈبیا کے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ دوا فروش نے بڑی احتیاط سے ڈبیا کے اندر سے ایک گولی نکالی، بھورے سے رنگ کی، کچھ سیاہی مائل، کچھ مٹیالی سی گولی۔ اور اسے مجمع کو دکھاتے ہوئے بولا۔ "یہ ہے میری برسوں کی ریاضت کا صلہ۔ یہ ہے وہ مشک جس کی خوش بو سے سارا جنگل دیوانہ ہو جاتا ہے۔ تم لوگوں نے پہلے کبھی دیکھی ہے؟"

"نہیں۔"

"پہلے کبھی سونگھی ہے؟"

"نہیں۔"

"تو لو، تم بھی کیا یاد کرو گے کہ ایک درویش کیسا تحفہ سنگھا گیا تھا۔"

یہ کہہ کر اس نے وہ گولی قریب کھڑے ہوئے شخص کے ہاتھ میں دے دی۔ "سونگھ لو، سونگھتے جاؤ، آگے والے کو بڑھاتے جاؤ۔"

یہی ہوا۔ اُس ایک لڑکے کے سوا سارے مجمع نے مشک کی گولی ہاتھوں میں لے کر سونگھی جو بالآخر دوا فروش کے پاس آگئی۔ اب تقریر آگے بڑھی۔ پہلے اس نے مشک کے نقصانات بتائے۔ "کسی کے زخم سے چھوا دو، وہ زخم عمر بھر نہیں بھرے گا۔ کسی گھاؤ میں اس کا سفوف ٹپکا دو، وہ ساری عمر گھاؤ ہی رہے گا۔ اور اب سنو اس کے فائدے۔"

یہ کہہ کر اس نے عین مقابل بیٹھے ہوئے لڑکے کو غور سے دیکھا۔ یوں دیکھا جیسے اس سے کہہ رہا ہو: تم چلے جاؤ منّے، تمہارا یہاں کیا کام۔

دوافروش نے لفظ چبا چبا کر مشک کے فائدے گنوانے شروع کیے۔

"جو کوئی اسے بازو پر باندھ لے اس کی شان ہی نرالی ہو جاتی ہے۔ یوں گردن تن جاتی ہے، یوں سینہ تن جاتا ہے --" یہاں پہنچ کر اس نے اپنی رٹی رٹائی تقریر کے کچھ جملے چھوڑے اور بتانے لگا کہ آس پاس کی حسیناؤں اور گلی محلے کی دوشیزاؤں پر اس کا کیا اثر ہوتا ہے۔ اور اگر کوئی اسے بازو پر باندھ لے اور کسی سے ہاتھ ملالے تو اس کا دل موم ہو جاتا ہے، مشک کی تاثیر کا عجب حال ہے۔

یہ کہہ کر دوافروش نے اعلان کیا کہ وہ مشک کی اس گولی کو اپنی مُٹھی میں دبالے گا اور پھر سارا مجمع ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے گا، یہاں تک کہ آخری آدمی خود دوافروش کا ہاتھ پکڑے گا۔

اُس ایک لڑکے کے سوا سارے مجمع نے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑ کر زنجیر سی بنالی۔ دوافروش نے اعلان کیا کہ مشک کی خوش بو ہاتھوں ہاتھ پھیلتی ہوئی ہر ایک کے ہاتھوں میں پہنچ جائے گی۔

مجمع میں سے کوئی شخص بولا۔ "اور اگر کسی کے ہاتھ میں نہ پہنچی؟"

"تو سمجھو وہ حرامی ہے۔"

دوافروش کی اس بات پر ایک کے سوا ہر ایک ہنسا۔ جب ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے کچھ دیر گزر گئی اور دوافروش نے یہ مژدہ سنادیا کہ لاکھ جتن کر کے حاصل ہونے والی یہ مشک کی گولی ایک روپے میں خریدی جاسکتی ہے تو اعلان ہوا کہ اب سب اپنے اپنے ہاتھوں کو سونگھیں۔

ہر طرف سے واہ، ارے واہ کی صدائیں بلند ہوئیں۔ ہر ایک کی مٹھی مہک رہی تھی، ہر ایک کی انگلیوں میں خوش بو بسی ہوئی تھی۔ قریب تھا

کہ دوافروش اپنی جھولی سے وہی آئینے والی ڈبیاں نکالے اور ایک ایک روپے میں بیچنا شروع کرے کہ ایک آواز آئی، آگے بیٹھے ہوئے اُسی لڑکے کی آواز۔ ''مداری تم حرامی ہو۔''

''کیوں؟'' دوافروش نے زوروں سے اور باقی مجمع نے خاموشی سے کہا۔ ''کیوں؟''

''اس لئے کہ تم نے پہلے یہ گولی سونگھنے کے لئے ہر ایک کے ہاتھ میں دی۔ ہاتھوں میں خوش بو تو اُسی وقت آگئی تھی۔ پھر تم نے لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے ایک دوسرے کے ہاتھ پکڑوائے جیسے یہ خوش بو ہاتھوں ہاتھ پھیلی ہو۔ اب تم ان بے چاروں کو الو بنارہے ہو۔ اب بتاؤ حرامی کون ہے؟''

لڑکا اٹھ کر جانے لگا۔ مجمع نے جلدی سے راستہ دے دیا۔

کچھ دور جاکر اُسے یوں ہی کچھ خیال سا آیا۔ اس نے اپنی ہتھیلیاں سونگھیں۔

اُس کے سینے میں دھک سے کچھ بولا۔

پیدائشی کوتوال

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خان محمد کو خدا نے اپنے ہاتھ سے کوتوال بنایا تھا۔

ان کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، بولنا چالنا اور ڈانٹنا ڈپٹنا بالکل کوتوالوں جیسا تھا۔ جب وہ سینہ تان کر کھڑے ہوتے اور بولنے کے لئے منہ کھولتے تو صاف لگتا تھا کہ آواز ان کے حلق سے نہیں بلکہ اندر کہیں پھیپھڑوں کی گہرائی سے نکل رہی ہے۔ غصّے کی حالت میں جس طرح ان کے نتھنے پھڑ پھڑاتے تھے، شاید ہی کسی دوسرے کوتوال کے پھڑ پھڑاتے ہوں۔ نھو حجام کہا کرتا تھا کہ خان محمد پیدائشی کوتوال ہے۔ مگر یہ بات کہنے سے پہلے وہ اچھی طرح اطمینان کر لیتا تھا کہ خان محمد کہیں آس پاس موجود تو نہیں۔

کبھی کسی نے خان محمد کو کسی پر ظلم کرتے نہیں دیکھا۔ کوتوالی کی اونچی دیواروں کے پیچھے وہ مجرموں کے ساتھ کیسا سلوک کرتے تھے، اس کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ کوتوالی کا حال مجرم ہی جانتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ کوتوالی کے باہر انہوں نے کبھی کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔

ایک بار شریر لڑکوں نے شدید گرمی کے دنوں میں سڑک کے نرم پڑے ہوئے کولتار میں روپے کا سکّہ گڑو کر اس پر پیشاب کیا اور جب سکّہ اچھی طرح جم گیا تو لڑکے چھپ کر راہ گیروں کا نظارہ کرنے لگے۔ مقصد یہ

تھا کہ جب کوئی راہ گیر سڑک پر پڑا ہوا سکہ اٹھانے کی کوشش کرے گا اور سکہ نہیں اٹھے گا اور جب راہ گیر پیشاب میں بھیگی ہوئی انگلیاں اپنے ہی کپڑوں سے پونچھے گا تو لڑکے باہر نکل کر اور تالیاں بجا کر اس کا مذاق اڑائیں گے۔

لڑکے تپتی ہوئی سڑک کی سطح پر چمکتا ہوا سکہ جما کر اپنی کمیں گاہوں میں چھپے ہی تھے کہ دور سے کوتوال خان محمد آتے ہوئے دکھائی دیئے۔

ایک لڑکا آہستہ سے بولا۔ ''ابے مر گئے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''کوتوال آ رہا ہے۔ اگر اس نے سکہ اٹھایا تو بہت برا سلوک کرے گا۔''

تیسرے نے پوچھا۔ ''کیا کرے گا؟''

چوتھے نے، جو عمر میں بڑا تھا، کوتوال کے سلوک کا پانچ چھ لفظوں میں ایسا نقشہ کھینچا کہ نوعمر لڑکوں نے اپنے بدن بھینچ لئے۔

گرمی سے نرم پڑی ہوئی سڑک پر خان محمد کے جوتوں کی آواز نہیں نکل رہی تھی بلکہ گھوڑے کی نعلوں جیسی ایڑیوں کے نشان بنتے جا رہے تھے۔ آڑ میں چھپے ہوئے لڑکے دم سادھے بیٹھے تھے اور ان کی سانسوں میں ان کی یہ دعا صاف سنائی دے رہی تھی کہ سکے پر کوتوال کی نگاہ نہ پڑے۔

مگر خدا کی مصلحتوں کو کون جانتا ہے۔ اس نے لڑکوں کی دعا سنی ان سنی کر دی۔ کوتوال سکے کے سامنے آ کر یوں رک گئے جیسے ریلوے کراسنگ کا پھاٹک اچانک بند ہو جائے اور ٹریفک یک لخت ساکت ہو جائے۔

انہوں نے کچھ دیر سکے کا جائزہ لیا۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور جب یقین ہو گیا کہ کوئی نہیں دیکھ رہا تو وہ گھٹنے موڑے بغیر جھکے اور سکہ اٹھانے کی

کوشش کرنے لگے۔ اگلے ہی لمحے انہیں اندازہ ہو گیا کہ یہ محلے کے لڑکوں کی شرارت ہے اور انہوں نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ لڑکے کسی اٹریا پر کسی منڈیر کی آڑ سے یہ سارا منظر دیکھ رہے ہوں گے۔ لیکن وہ دوبارہ تن کر یوں کھڑے ہو گئے جیسے کبھی جھکے ہی نہ تھے۔ چپکے سے اپنی انگلیاں اپنی وردی سے پونچھیں اور جوتوں کی ایڑیوں کے نشان بناتے ہوئے وہ یوں آگے بڑھ گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ یہاں تک کہ وہ اگلے چوک تک پہنچے اور کوتوالی کی طرف مڑ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

لڑکوں نے ذرا دیر پہلے جس روپے پر پیشاب کیا تھا، اب اس پر خاک ڈالی اور بھاگ گئے۔ انہیں ڈر تھا کہ شام تک پولیس والے آئیں گے اور ایک ایک کو پکڑ کر کوتوالی لے جائیں گے۔ پولیس والے آئے ضرور لیکن چاقو کی نوک سے وہ سکہ اکھاڑ کر ساتھ لے گئے۔

نھو حجام بتاتا ہے کہ کوتوال نے ایک بار ایک گرہ کٹ کو رنگے ہاتھوں پکڑا۔ ایک مرتبہ ایک اٹھائی گیرے کی گردن دبوچی اور ایک رات ایک نقب زن کو اس حالت میں پکڑا کہ اس کا اگلا دھڑ نقب کے اندر تھا اور پچھلا دھڑ باہر، مگر خان محمد نے کسی کو نہ مارا نہ پیٹا بلکہ اُس روز تو لوگوں نے انہیں ہنستا ہوا بھی دیکھا۔

ہوا یہ کہ نقب زن گڑگڑانے لگا۔ ”کوتوال صاحب۔ مجھے ماریئے گا نہیں۔ ابھی ابھی سحری کھا کر آیا ہوں، روزے سے ہوں۔“

لیکن خان محمد جس بات پر ہنسے وہ یہ بات نہیں تھی۔ وہ تو اس وقت ہنسے جب نقب زن اپنے باپ کے مارے جانے کا قصہ سنا رہا تھا۔ کہنے لگا کہ

میرے باپ بڑے باکمال نقب زن تھے۔ ایک روز ایک کافر کے گھر میں نقب لگا کر اندر داخل ہو رہے تھے۔ اتفاق سے اُس وقت کافر جاگ رہا تھا۔ جوں ہی باپ نے نقب میں سر ڈالا، کافر نے ان کے ماتھے پر گنڈاسا مارا اور باپ وہیں شہید ہو گئے۔

خان محمد کوتوال کے ہنسنے کی خبر فلیتے کی آگ کی طرح پورے بازار میں پھیل گئی۔

اس کے بعد بستی میں اُن کے ایک اَور قہقہے کی دھوم مچی۔

ہوا یہ کہ ایک عادی مجرم گرفتار کر کے لایا گیا۔ اس نے اپنی ساری عمر چوری چکاری میں گزاری تھی اور صورت سے بھی ڈاکو نظر آتا تھا۔ اسے کوتوال خان محمد کے سامنے پیش کیا گیا۔ خان محمد نے اس سے کہا۔ "تمہیں معلوم ہے، مرنے کے بعد سیدھے جہنّم میں جاؤ گے۔"

وہ بولا۔ "میں تو خود جہنم میں جانا چاہتا ہوں۔"

خان محمد نے اقبالِ جرم کے سینکڑوں بیانات سنے تھے مگر کبھی کسی مجرم نے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ دوزخ میں جانے کا خواہش مند ہے۔ کوتوال نے گرجنے کے بجائے آہستہ سے پوچھا۔ "بھلا کیوں؟"

مجرم بولا۔ "وہاں مُلّا نہیں ہو گا۔"

یہ سننا تھا کہ کوتوال پر ہنسی کا دورہ پڑا۔ قہقہے لگاتے لگاتے ان کی آنکھوں میں پانی آ گیا اور منہ سے رال بہنے لگی۔ اس سے پہلے کہ ہنسی کا یہ دورہ دل کے دورے میں تبدیل ہوتا، سپاہیوں نے کہہ سن کر ان کے قہقہے قطع کرائے۔

نھو حجام کہتا ہے کہ ایک روز خان محمد نے کوتوالی میں کبڈّی کے

مقابلے کا اعلان کیا اور خود بھی کھیلنے کا فیصلہ کیا لیکن جب سپاہیوں سے دو ٹیمیں بنانے کے لئے کہا گیا تو سپاہی مچل گئے اور ان کی مخالف ٹیم میں شامل ہونے سے انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

نھو حجام تو یہ بھی کہتا ہے کہ وہ مجرم کو مارتے پیٹتے نہیں تھے۔ صرف اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر گھور کر دیکھتے تھے۔ مجرم پہلی سانس میں اقبالِ جرم کر لیتا تھا اور دوسری سانس میں گھر سے نیا پاجامہ منگانے کی التجا کرتا تھا۔

نھو حجام یہ بھی کہتا ہے کہ ایک رات کوتوال کی ماں نہا دھو کر، کنگھی چوٹی کر کے اور اجلے کپڑے پہن کر سوئیں اور اگلی صبح جب وہ دیر تک نہیں اٹھیں اور کسی نے جا کر ان کا شانہ ہلایا تو پتہ چلا کہ وہ اس دنیا سے اٹھ چکی ہیں۔

بستی میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور سہ پہر کو جب کوتوال کی ماں کا جنازہ اٹھا تو لوگ کہتے ہیں کہ سارے ہی بستی والے جنازے میں آئے۔ اس کے بعد حکایت یوں چلتی ہے کہ تھوڑے ہی عرصے بعد موت کا فرشتہ آیا اور خان محمد کی روح قبض نہیں کی بلکہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یوں گھورا کہ دوسری سانس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ ان کی روح نے یوں چپ سادھ کر پرواز کی کہ پروں کے پھڑپھڑانے کی آواز بھی نہیں سنائی دی۔

خان محمد کوتوال مر گئے۔
بستی کے لوگوں کا خیال درست نکلا۔
ان کے جنازے میں کوئی نہیں آیا۔

دری

یہ بالکل سچ ہے کہ بڑے بوڑھوں کے مشورے اکثر بڑے کام کے ہوتے ہیں، چنانچہ جب فاروق روزگار کی تلاش میں شہر جانے لگا اور چودھری رحمت الٰہی کو سلام کرنے پہنچا تو چودھری صاحب نے دعائیں دیتے ہوئے اور شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ بیٹے، شہر جانا تو ساتھ ایک دری ضرور لیتے جانا۔

فاروق نے وہ دری ہمراہ لے لی جس پر اس کے بڑے بہنوئی کو بجلی کا جھٹکا لگنے کے بعد لٹایا گیا تھا اور اس نے وہیں دم توڑا تھا اور جس پر اس کی چھوٹی بہن دلہن بن کر بیٹھی تھی۔

دری کو لپیٹتے ہوئے وہ سوچتا رہا کہ خدا جانے یہ دری نیک ہے یا منحوس۔ ایک بار اس نے چاہا کہ دری کو سونگھ لے مگر پھر خیال آیا کہ گھر میں کون سی دس دریاں دھری ہیں کہ اِس کی بو اچھی نہ ہوئی تو وہ دوسری یا تیسری یا چوتھی دری لے جائے گا اور پھر یہ کہ اسے دری سے غرض ہے، دری کی بو میں کیا رکھا ہے۔

شہر پہنچ کر وہ دن بھر نوکری کی تلاش میں گھومتا رہا۔ شام تک وہ تھک کر نڈھال ہو چکا تھا اور اسے پیٹ بھرنے کی فکر تھی۔ دری کا خیال اسے اس وقت آیا جب نیند نے آکر اس کے پپوٹوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کی۔

پارک کی بنچ پر دری بچھاتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں خدا کا اور چودھری رحمت الٰہی کا شکر ادا کیا۔ پھر جو وہ گھوڑے بیچ کر سویا تو صبح اسے ذرا ذرا سا یاد تھا کہ رات کوئی اس کے نیچے سے دری کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس نے نیند کی حالت میں اُسے دری چور کہا تھا یہ کچھ اسی قسم کی گالی دی تھی۔

دن آتے رہے، جاتے رہے اور ہر جاتا ہوا دن جاتے جاتے مایوسی اور ناامیدی کی داستانیں رقم کرتا رہا، یہاں تک کہ فاروق گھر سے جو تھوڑی سی رقم لایا تھا اس کے نوٹ ختم ہو گئے اور صرف ٹھن ٹھن بولتی ہوئی ریز گاری باقی رہ گئی۔

اُس روز وہ نوکری ڈھونڈنے کہیں نہیں گیا بلکہ وہیں پارک میں بیٹھا سوچتا رہا کہ اب کیا سوچے اور کیا نہ سوچے۔ اس کی پشت پر فٹ پاتھ تھا اور فٹ پاتھ پر وہ شخص صبح ہی سے دری بچھا کر بیٹھ گیا تھا جس کے پاس ایک پنجرہ تھا، پنجرے میں ایک پرندہ تھا، سامنے بند لفافوں کی قطار چنی تھی۔ لوگ اس شخص کو ایک آنہ دیتے تھے۔ وہ پرندے کو ذرا دیر کے لئے پنجرے سے رہا کرتا، پرندہ باہر آ کر لفافوں کی قطار پر ایک نگاہ ڈالتا اور ایک لفافہ ذرا سا سر کا دیتا۔ اس کا مالک انعام کے طور پر پرندے کو بھیگی ہوئی دال کا ایک دانہ دیتا اور سر کا ہوا لفافہ کھول کر اور اندر سے ایک کاغذ نکال کر اکنّی دینے والے کو اس کی قسمت کا حال پڑھ کر سنا دیتا۔

دن ڈھلے تک جس وقت پرندے کا پیٹ اتنا بھر چکا تھا کہ اس نے لفافہ کھینچنے کے عوض دال کا دانہ کھانے سے انکار کر دیا، اس وقت فاروق کے پیٹ میں بھوک کا درد شروع ہو چکا تھا۔ وہ اٹھا اور فٹ پاتھ پر پہنچ کر جیب سے اکنّی نکالی اور پرندے والے کے ہاتھ پر رکھ دی۔ پرندہ، جس پر اب

غنودگی طاری ہو چلی تھی، کچھ اس ادا سے پنجرے سے باہر نکلا جیسے اپنے مالک پر اور قسمت کا حال جاننے والے پر سو احسان کر رہا ہو۔ اس نے بد دلی سے ایک لفافہ کھینچا اور بے اعتنائی سے پنجرے میں واپس جا کر، آنکھیں موند کر بیٹھ گیا۔

قسمت کا حال بتانے والے نے لفافے کے اندر سے پرچہ نکالا اور پڑھنا شروع کیا۔ ابھی اس نے پہلا فقرہ پڑھا تھا کہ باقی فقرے فاروق نے خود ہی سنا دیئے کیونکہ یہ مضمون وہ صبح سے اب تک دس بارہ دفعہ سن چکا تھا، بلکہ اس نے یہ بھی کہا کہ کاش وہ والا لفافہ نکلتا جس میں لکھا ہے کہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں تمہاری مراد پوری ہو جائے گی۔

"کیا مراد ہے تمہاری؟" پرندے کے مالک نے پوچھا۔

"مراد کیا ہونی ہے، دس دن سے نوکری ڈھونڈ رہا ہوں، جہاں جاتا ہوں لوگ اِتنا بڑا سا سر ہلا دیتے ہیں۔ حیرت ہے، کہیں کوئی جگہ خالی نہیں ہے۔"

"نہیں ہے؟"

"نا۔ اب اگر خالی ہے تو سُسری اپنی جیب خالی ہے۔"

"ایک پیسہ بھی نہیں ہے؟"

"ہے۔ بس ایک اکنّی ہے۔"

"لاؤ وہ مجھے دو، میں تمہیں دھندا بتاتا ہوں۔"

فاروق نے قمیص کی گہری جیب میں دو انگلیاں ڈالیں، تنہا اکنّی ڈھونڈنا بھی بھلا کوئی مشکل کام تھا۔ ادھر اکنّی ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل ہوئی، اُدھر پرندے کے مالک نے اپنی عقل کا پنجرہ کھولا، اس میں سے

ذہن کا پرندہ نکلا جس نے سمجھ داری کے قطار در قطار چنے ہوئے لفافوں میں سے ایک ذرا سا سرکایا، پرندے کے مالک نے اسے کھولا اور اس کا مضمون منہ زبانی سنا دیا۔ "کیوں اِدھر اُدھر وقت بے فضول ضائع کرتے پھر رہے ہو۔ سڑک کے کنارے دری بچھاؤ۔ ایک گتّے پر لکھو کہ یہاں ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر قسمت کا حال بتایا جاتا ہے۔ اگر قسمت اچھی ہوئی، اُس کی نہیں، تمہاری، تو کما کھاؤ گے۔ پڑھے لکھے ہو۔ جو بات بھی بتانا ذرا پوچھنے والے کی آنکھوں میں جھانک کے بتانا۔"

"اچھا۔"

"اور ایک ضروری بات۔ اس میری والی سڑک پر نہ بیٹھنا۔ کسی دوسری سڑک پر بیٹھنا۔ کیا سمجھے۔"

اور فاروق اس کیا سمجھے کا جواب دیئے بغیر اٹھ گیا۔

اگلی صبح اس نے لڑکیوں کے اسکول اور دفترِ روزگار کے درمیان سڑک کے کنارے دری بچھائی۔ جوتے کے ایک خالی ڈبّے کا پیندا نکال کر اس پر ہاتھ کی لکیریں دیکھے جانے کا اعلان لکھا اور دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پہلے تو وہ گردن اٹھا کر آتے جاتے راہ گیروں کی صورتیں دیکھتا رہا لیکن جب گردن دکھنے لگی اور یہ طے کرنے میں دشواری ہونے لگی کہ درد اٹھی ہوئی گردن میں زیادہ ہے یا بھوکے پیٹ میں، تو اس نے سر جھکا لیا۔

اب وہ آتے جاتے لوگوں کے جوتے دیکھنے لگا۔

جب مردانہ جوتے ختم ہوئے اور دفتروں کو جانے والے جا چکے تو زنانہ جوتوں کی باری آئی۔ لڑکیوں کے اسکول کا وقت ہو رہا تھا۔ سیاہ سینڈل، سنہرے سینڈل، سرخ چپلیں، سبز چپلیں، بند جوتے، کھلے جوتے، ملتانی

جوتے، کشمیری سلیپریں، بہاول پوری ڈھسّے، یہ سب اس کے سامنے سے گزرنے شروع ہوئے۔ کچھ دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ جوتے کم اور ان کے اندر پیر زیادہ دھیان سے دیکھ رہا ہے۔ سانولے پیر، گورے پیر، سانولے پیر لیکن گورے تلوے، گورے پیر لیکن سرخ ایڑیاں، ترشے ہوئے ناخن، بڑھے ہوئے ناخن، نیل پالش سے سجائے ہوئے ناخن۔ کسی کسی پیر میں پڑی ہوئی پازیب، پیر کی انگلیوں میں پڑے ہوئے چاندی کے چھلّے، چھلّوں میں پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھنگرو، کچھ پیر بالکل صاف اور کچھ پر ہلکے ہلکے بھورے بھورے روئیں۔

وہ گردن جھکائے جھکائے دیکھتا رہا۔ کسی کسی پیر کو دیکھ کر اس کا جی چاہا کہ گردن اٹھا کر اوپر بھی دیکھ لے کہ اچھے پیروں والیوں کے چہرے کیسے ہوتے ہیں مگر اس نے جی کڑا کر کے گردن جھکائے رکھی کیوں کہ تین دن سے اس نے شیو نہیں بنوایا تھا۔

لڑکیاں سامنے سے گزرتی گئیں، شاید اسکول لگنے ہی والا تھا کیونکہ اب ان کی چال تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اچانک ایک لڑکی کے اجلے اجلے پیروں پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے روپہلی چپل پہن رکھی تھی، گلابی ناخنوں پر اس نے شاید بے رنگ پالش لگا رکھی تھی۔ ایک پیر میں چاندی کی پازیب تھی اور ایک انگوٹھے میں چھلا پڑا ہوا تھا، شلوار ذرا سی اونچی تھی اور پیروں میں بھورے بھورے روئیں اچھے لگ رہے تھے۔

فاروق کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے اسے بھی اسکول پہنچنا ہو اور گھنٹی بجنے میں چند لمحے رہ گئے ہوں۔ اچانک دو چیزیں رکیں۔ لڑکی کے قدم اور فاروق کا دل۔ غنیمت ہوا کہ جب لڑکی بیٹھی، فاروق کا دل نہیں بیٹھا۔

اب سامنے لڑکی کا ہاتھ پھیلا ہوا تھا۔ فاروق کو آواز سنائی دی۔ وہ سمجھا کہ پازیب بج رہی ہے۔ لڑکی کہہ رہی تھی۔ ''آپ میری قسمت کا حال بتا سکتے ہیں؟''

فاروق سنبھل کر بیٹھ گیا اور گردن جھکائے جھکائے بولا۔ ''ہاں ہاں، کیوں نہیں، کیوں نہیں۔''

اور پھر وہ لڑکی کے ہاتھ کی لکیریں دیکھنے لگا، جیسے کوئی ان پڑھ قانون کی کتابیں دیکھ رہا ہو۔ اچانک اسے پرندے کے مالک کی ہدایت یاد آئی۔ ''ذرا پوچھنے والے کی آنکھوں میں جھانک کے بتانا۔''

اس نے گردن اٹھائی اور لڑکی کی آنکھوں میں جھانکا۔ لڑکی پہلے ہی اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو فاروق بھول گیا کہ کون کس کی قسمت کا حال بتانے والا ہے۔ پھر اس نے جتن کر کے خود کو سنبھالا اور بولا۔ ''آپ کو--- آپ کو محبت ہے کسی سے؟''

''ہاں ہاں، اَور بتایئے۔''

''مگر اسے محبت ہے کسی اَور سے۔''

''اَور؟''

''وہ آپ سے بات نہیں کرتا۔''

''نہیں۔''

''آپ کے خطوں کے جواب نہیں دیتا۔''

''نہیں۔''

''آپ نے اس کی سال گرہ کا کارڈ بھیجا تھا۔''

''ہاں۔''

"اس نے صرف تھینک یو کہہ کر فون بند کر دیا۔"

"ہاں ہاں اور بتایئے مگر جلدی کیجئے، اسکول کی گھنٹی بجنے والی ہے۔"

"اس علم میں سر دکھنے لگتا ہے۔ باقی کل بتاؤں گا۔"

"وعدہ کیجئے۔"

"کیا۔"

"کل۔ اِسی جگہ۔ میں ذرا پہلے آجاؤں گی تا کہ ---"

"ہاں، وعدہ رہا۔"

لڑکی نے اٹھنے سے پہلے جلدی جلدی اپنا بٹوا کھولا۔ فاروق نے سر دوبارہ جھکالیا۔ اُس نے بٹوے سے نوٹ نکلنے کی آواز سنی۔ وہ حیران تھا کہ اتنی ذرا سی محنت کی کتنی اجرت ہونی چاہیئے۔ اُسے یقین تھا کہ ایک روپے کا نوٹ ہو گا۔ اس نے خوشی خوشی لے کر مٹھی میں دبالیا۔

لڑکی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چلی گئی۔ اب فاروق کو خیال آیا کہ اس نے قسمت کا حال ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر نہیں، لڑکی کی آنکھیں دیکھ کر بتایا تھا۔ لکیر تو سے ایک بھی یاد نہ تھی البتہ سیاہ آنکھیں آنکھوں سے اوجھل ہو جانے کے باوجود بولے جا رہی تھیں۔ کیسے دست شناس ہو؟ یہ سوچ کر فاروق نادم ہوا ہی چاہتا تھا کہ اسکول کے احاطے کے اندر سے لڑکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ کوئی حمد گا رہی تھیں۔ ساری کی ساری بے سُری تھیں۔ بس ایک آواز بہت سریلی تھی۔

اچانک فاروق کو خیال آیا کہ ہاتھ کی لکیروں میں کیا ہوتا ہے، کچھ ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ یہ دیکھنے کے لئے اس نے اپنی بند مٹھی کھولی۔ اس کے

سوال کا جواب سامنے رکھا تھا۔ جسے وہ ایک کا سمجھ بیٹھا تھا، وہ پانچ روپے کا نوٹ تھا۔

اُس نے دری لپیٹ کر اپنے سینے سے چمٹائی اور حجام کی دکان کی طرف لپکا جہاں گرم غسل کا بندوبست بھی تھا۔ وہ نہاتے نہاتے گنگنانے لگا۔ غسل خانے میں خدا جانے کہاں سے اتنی بھاپ بھر گئی۔ جیسے بادلوں میں سے کبھی کبھی آسمان نظر آتا ہے، اسے دیوار پر پڑی ہوئی اپنی دری نظر آئی۔ وہی چھوٹی سے دری جو چودھری رحمت الٰہی نے کہا تھا کہ ضرور لے جاتا۔

فاروق نے گنگناتے گنگناتے دری کھینچی اور اسے سونگھنے لگا۔ بھاپ سے بھرے ہوئے غسل خانے میں اس دری سے بالکل وہی خوشبو آرہی تھی جو دلہنوں میں سے آتی ہے۔

ونس مور

ماسٹر وقار اپنے زمانے کے مانے ہوئے اداکار تھے۔ تھیٹر کی دنیا میں ان ہی کا ڈنکا بجا کرتا تھا۔ ان کی کمپنی جس شہر میں بھی جا نکلتی وہاں دھوم مچ جاتی۔ اگلی نشستیں لینے کی خاطر لوگ کیسے کیسے جتن کرتے۔ جھوٹ بولنے سے لے کر اوپر سے فالتو پیسے دینے تک، جیسے بھی بن پڑتا لوگ آگے والی سیٹیں حاصل کر لیتے اور پھر ماسٹر وقار کی اداکاری کے کمالات دیکھتے۔

ماسٹر وقار کا یہ حال تھا کہ سینکڑوں کے مجمع کو گھڑی بھر میں ہنسا دیتے۔ لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ پھر وہ کھچا کھچ بھرے ہوئے تھیٹر کو لمحہ بھر میں رلا دیتے۔ مرد تو صرف آنسو بہا کر رہ جاتے مگر عورتیں پچھاڑیں کھانے لگتیں اور بے چارے شوہر اپنا رونا اور اسٹیج کے منظر بھول بھال کر انہیں سنبھالنے میں لگ جاتے۔

آخر کار پردہ گرتا اور ماسٹر وقار داد وصول کرنے کے لئے نمودار ہوتے تو لوگ تالیاں بجا بجا کر پورا ہال سر پر اٹھا لیتے۔ کچھ لوگ پھول پھینکتے اور کچھ نوٹ پھینکتے۔ کبھی کبھی اس میں کوئی سونے کا بُندا بھی ہوتا اور کبھی کوئی انگوٹھی۔ زنانہ۔

جب ماسٹر وقار کی دو بیویوں سے گیارہ بچّے ہو گئے اور تیسری بیوی افق پر نمودار ہوئی تو انہوں نے اداکاری چھوڑی اور زمینداری سنبھال لی۔

ان کی کچھ زمینیں اعظم نگر میں تھیں اور کچھ روپ نگر میں لیکن سب سے بڑا قطعہ اراضی پھول پور میں تھا جہاں انہوں نے ایک کشادہ مکان بھی بنوالیا تھا اور کبھی کبھار بال بچوں کے ساتھ لدے پھندے وہاں پہنچتے تھے اور گرمیاں وہیں گزارتے تھے۔ یہ جگہ ترائی میں تھی اس لئے موسم خوش گوار تھا۔ اس کے علاوہ شکار بہت تھا اور پھلوں کی بہتات تھی۔

اُس روز جب ماسٹر وقار، ان کی دونوں بیویاں، گیارہ کے گیارہ بچّے، ایک باورچی اور اوپر کے کام کا ایک لڑکا، یہ سب ریل گاڑی میں چڑھے تو وہ چھوٹا سا ڈبّا بھر گیا۔ بیویوں نے قرینے سے اسباب جمانا شروع کیا۔ لڑکوں نے دھما چوکڑی شروع کی، لڑکیوں نے بستر بند کھولے اور ماسٹر صاحب نے اعلان کیا۔ ”کھڑکیوں کے شٹر گرادو۔ دروازے اچھی طرح بند کرلو۔ اب اس ڈبے میں کوئی غیر آدمی نہیں چڑھے گا۔ ہم لوگ پھول پور تک آرام سے سفر کریں گے۔“

یہی ہوا۔ کھڑکیاں دروازے اچھی طرح بند کر دیئے گئے۔ سب کو ہدایت کر دی گئی کہ جوں ہی کوئی اسٹیشن آئے گا، سب لوگ دروازے کے پیچھے جمع ہو جائیں گے تاکہ یلغار کرنے والوں سے بات کرنے کے لئے کھڑکی کھولی جائے تو ڈبّا بھرا ہوا نظر آئے۔ دوسرے یہ کہ دروازے کے پیچھے اتنی افرادی قوت جمع ہو جائے کہ باہر کا مجمع کتنا ہی زور لگائے، دروازہ کھلنے نہ پائے۔

اس بار بھی یہی ہوا۔ گاڑی کا پنیالے کے اسٹیشن پر رکنا تھا کہ مسافروں اور قلیوں نے دروازے پر ہلّا بول دیا اور ڈبے کی کھڑکیوں کو پیٹنے لگے۔

ماسٹر وقار نے اپنی ٹیم کی کپتانی سنبھالی اور طے شدہ منصوبے پر عمل شروع ہو گیا۔ ماسٹر صاحب نے دروازے کی کھڑکی کھولی اور اس سے پہلے کہ چار مسافر کھڑکی کے راستے اندر گھسیں، آٹھ گردنیں اسی کھڑکی کے راستے باہر نمودار ہوئیں اور لگیں چلّانے۔ ''اندر جگہ نہیں ہے۔ ڈبا فُل ہے۔'' ماسٹر وقار کو تو جوشِ خطابت میں کئی بار یہ کہتے سُنا گیا۔ ''اندر جگہ نہیں ہے، ہاؤس فُل ہے۔''

جب زیادہ تر مسافر اور بیشتر قلی مایوس ہو کر اگلے ڈبوں کی طرف لپک گئے یعنی ہاتھ پیر مارنے والے چلے گئے اور صرف زبانی بحث کرنے والے چند مُسافر رہ گئے تو زور آزمائی ختم ہوئی اور مکالمہ آرائی شروع ہوئی۔

کسی نے کہا کہ دروازہ کھولو ورنہ پولیس کو بلالوں گا۔

اس پر ماسٹر وقار نے جو آخر آخر رام لیلا میں راون کا کردار ادا کرنے لگے تھے، ایسے زور کا قہقہہ لگایا کہ اسٹیشن کے سائبان سے لٹکے ہوئے بندر ٹپاٹپ پلیٹ فارم پر گرے۔ ایک مسافر نے طوطے کا پنجرا اٹھا رکھا تھا۔ وہ طوطا چونکہ ماسٹر صاحب کے پورے کھلے ہوئے منہ سے بمشکل ڈیڑھ دو بالشت کے فاصلے پر تھا، وہیں تیورا کے گرا اور لگا پچھاڑیں کھانے۔

ایک اور مسافر نے کہا۔ ''صاحب جی، مجھے بٹھالو۔ صبح کچہری میں میری پیشی ہے، نہیں پہنچا تو مقدمہ ہار جاؤں گا۔''

یہ سنتے ہی ماسٹر وقار کے چہرے کا رنگ بدلا۔ ان پر رقت طاری ہونے لگی اور قریب تھا کہ آنکھوں میں آنسو آجائیں، اس سے بولے۔ ''خدارا کسی اَور ڈبے میں چلے جاؤ، کہیں اَور بیٹھ جاؤ۔ اللہ نہ کرے تم مقدمہ ہارو، ورنہ سارا عذاب میری گردن پر ہوگا۔ میرے ڈبے میں تو تل دھرنے

کو جگہ نہیں ہے۔" ان کے ساتوں لڑکوں نے ان کی نہیں میں نہیں ملائی اور تھیٹر کے کورس کے انداز میں بولے۔ "نہیں، تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں ہے۔"

وہ غریب بڑی سعادت مندی سے اگلے ڈبے کی طرف دوڑنے لگا۔ اس کے بعد ایک ادھیڑ عمر مسافر آگے بڑھا۔ کبھی فوج میں رہا ہوگا۔ کم سے کم اس کی مونچھیں تو یہی کہتی تھیں مگر خود اس نے کہا۔ "صاحب، میری والدہ بہت بیمار ہیں۔ تار آیا ہے کہ فوراً پہنچو۔ مجھے اندر آنے دیجئے۔ ایک ٹانگ پر کھڑا رہوں گا۔ آپ کو کچھ نہیں کہوں گا۔ میری والدہ کی حالت نازک ہے۔"

سابق فوجی کا یہ کہنا تھا کہ ماسٹر صاحب دہاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ ان کے ساتوں لڑکے اور باورچی ہاتھ اٹھا کر فوجی کی ماں کی صحت یابی کی دعائیں مانگنے لگے۔ اوپر کے کام والا لڑکا اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔ "صاحب جی، قسم سے اندر جگہ نہیں ہے۔ ہوتی تو ہم آپ کو بٹھا لیتے۔" فوجی نے بیک وقت اتنے بہت سے مسافروں کو روتے پیٹتے دیکھا تو وہ بھی اپنی قسمت کو روتا ہوا اگلے ڈبوں کی طرف دوڑ پڑا۔ مگر چار پانچ مسافر اب بھی یہ آس لگائے کھڑے تھے کہ کہیں سے کوئی معجزہ ہوگا، اسی گاڑی کے اسی ڈبے کا یہی دروازہ کھلے گا اور انہیں داخلے کی سعادت نصیب ہو جائے گی۔

آخر ان میں سے ایک برقعہ پوش خاتون آگے بڑھیں۔ انہوں نے اپنی نقاب الٹ دی۔ ان کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیر رہے تھے اور قریب تھا کہ بڑے سلیقے سے لگایا ہوا کاجل رخساروں پر بہہ نکلے کہ ماسٹر وقار نے پہلو بدلا، ان کے جتنے بیٹے پندرہ سولہ سے اوپر ہو چکے تھے وہ

کسمسائے البتہ سب سے چھوٹا کہنے ہی والا تھا کہ جائیے اماں، آگے جائیے، ماسٹر وقار یوں گویا ہوئے۔ "آہ، ستم ایجاد دنیا نے کیسے ظلم توڑے ہیں تم پر، کچھ کہو کہ دل کا بوجھ ہلکا ہو۔"

اس پر وہ نازنیں بولی۔ "میرا شوہر جلاّد صفت ہے۔ اس نے اعلان کر رکھا ہے کہ صبح تک گھر نہ آئیں تو تین طلاقیں دے دوں گا، اس لئے خدارا کہیں کونے کھدرے میں بیٹھنے کی راہ دے دیجئے۔ آپ کو، آپ کے بال بچوں کو دعائیں دوں گی۔"

ماسٹر وقار نے محاذ نہیں چھوڑا اور آخری جنگ لڑی۔ "یہاں تو یہ عالم ہے کہ ڈبے کے اندر آدمی پر آدمی سوار ہے۔ مجمع کثیر، گرمی شدید۔ دل ڈھہا جائے ہے، کلیجہ منہ کو آئے ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی ایسا ڈبا ڈھونڈو جہاں تمہیں پیر ٹکانے کو جگہ مل جائے۔"

ماسٹر صاحب یہ مکالمہ ادا کرتے جاتے تھے اور ایک ہاتھ سے دروازے کی چٹخنی کھولتے جاتے تھے۔ بس اب اگلا منظر یہ تھا کہ گاڑی آہستہ آہستہ سرک رہی تھی اور نووارد خاتون پنکھے کے نیچے بیٹھی اپنے برقعے کے بند کھول رہی تھیں۔ پورا کنبہ ان کی طلاق کی کہانی سن چکا تھا اور انہیں یوں دیکھ رہا تھا جیسے خاتون نہ ہوں، کوئی میمنہ ہو جسے کل صبح ہونے سے پہلے پہلے بھوکے شیر کے آگے ڈال دیا جائے گا۔

بس یہ ضرور ہے کہ ماسٹر وقار کی پہلی بیوی منہ موڑ کر بیٹھ رہیں اور دوسری نے ہونہہ کہہ کر چپ سادھ لی۔

گاڑی چلتی گئی۔ سب لوگ آرام سے بیٹھ گئے۔ ناشتے دان کھلنے لگے۔ بیویوں نے دسترخوان بچھائے۔ لڑکیوں نے پوریاں ایک طرف چنیں

اور قیمہ دوسری طرف۔ نوکر پنکھوں کے رخ درست کرنے لگے اور لڑکے ہاتھ دھونے کے بہانے غسل خانے میں گھس گئے اور اندر سے کنڈی چڑھا کر کانا پھوسی کرنے لگے اور کھلکھلانے لگے۔ جب تک وہ بال سنوار کر باہر نکلیں، ماسٹر وقار نے کھانا شروع کر دیا تھا اور لڑکوں پر ڈانٹ پڑنے لگی تھی کہ اگلا اسٹیشن آنے سے پہلے پہلے کھانا ختم نہ کیا تو ایک ایک کا ٹینٹوا دبا دیا جائے گا۔

سب سے آخر میں نو وارد خاتون نے کھانا ختم کیا۔ لڑکوں نے بستروں کی چادروں سے انگلیاں پونچھ لیں۔ ماسٹر صاحب نے جو آستینیں چڑھا کر کھانا کھایا تھا وہ دوبارہ اتار دیں اور اس سے پہلے کہ ٹرین اگلے اسٹیشن پر رکے، پورے مجمع نے مورچہ سنبھال لیا۔ کمان اب بھی ماسٹر وقار کے ہاتھ میں تھی۔

ٹرین رکی، مسافروں کا ریلا آیا اور ڈبّے کے دروازے کا جوڑ جوڑ ہلنے لگا۔ ایک باپ اور سات نرینہ اولادیں، یہ سب ایک ساتھ چلاّئے۔

"اندر جگہ نہیں ہے۔ اندر جگہ نہیں ہے۔"

شہر کے ایک غنڈے نے آواز لگائی۔ "کھول کر دکھاؤ۔"

اس پر ماسٹر وقار کے پیچ و تاب کھانے اور لڑکوں کے کھلکھلانے کی آوازیں آئیں اور قریب تھا کہ چالاک قلی کھڑکی میں سے ہاتھ ڈال کے دروازے کی چٹخنی کھول دیں کہ نووارد خاتون اٹھیں، ماسٹر وقار کی کمر کے برابر سے، بڑے لڑکے کی بغل کے اندر سے، منجھلے لڑکے کے شانے کے اوپر سے اور چھوٹے کی گردن کے برابر سے انہوں نے اپنی گردن باہر نکالی اور لگیں چیخنے۔ "تم لوگوں کو سماعت ہے یا نہیں۔ کہہ دیا کہ اندر جگہ نہیں ہے۔

سمجھ میں آتا ہے یا کسی اَور طرح سمجھاؤں؟"

خاتون کو کمان سنبھالتے دیکھ کر سارے مرد آگے بڑھ گئے اور غنڈا چلتے چلتے کہہ گیا۔ "مار ڈالو۔" البتہ ایک عورت آگے بڑھی اور بڑی لجاجت سے بولی۔ "بی بی۔ مجھے صبح تک خان پور پہنچنا ہے۔ میرا شوہر بڑا ہی ظالم ہے۔ اس نے دھمکی دے رکھی ہے کہ صبح تلک نہ پہنچیں تو تین طلاقیں دے دوں گا ایک ہی باری میں۔"

عورت کا یہ کہنا تھا کہ کمان دار خاتون کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ بڑی مشکل سے ایک ہاتھ باہر نکالا اور اسے چلاتے ہوئے بولیں۔ "ساری جھوٹی عورتیں ایسے ہی قصّے گھڑتی ہیں۔ اپنا منہ دیکھا ہے طلاق والا؟ جاؤ جاؤ، اس ڈبے میں جھوٹوں کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔"

یہ کہہ کر خاتون نے دروازے کی کھڑکی کا شٹر اتنی زور سے گرایا کہ دیر تک گرداڑتی رہی اور ماسٹر صاحب کی انگلیاں پچّی ہوتے ہوتے بچیں۔

اب خاتون نے مڑ کر ڈبے کے اندر موجود تماش بینوں پر ایک فاتحانہ اور داد طلب نگاہ ڈالی۔ اور جب گاڑی چلی، وہ سب زور زور سے تالیاں بجا رہے تھے اور ماسٹر وقار کی دونوں بیویاں کسی تھیٹر کے ناظرین کی طرح ونس مور، ونس مور کے نعرے لگا رہی تھیں۔

اُن کی فرمائش پوری ہوئی۔

چند روز بعد ماسٹر صاحب کی ایک کم چار شادیاں ہو چکی تھیں اور نئی بیوی کو 'نو وارد دلہن' کا خطاب مل چکا تھا۔

گریڈ ۹ کا سپیرا

اِدھر یونی ورسٹی بن کر مکمل ہوئی، اُدھر ساون کی جھڑی لگی۔ اور ایک رات وہی ہوا جو ہر سال ہوا کرتا تھا۔ کوہِ سلیمان کی جانب سے بارش کے پانی کا ریلا آیا اور ایسا دندناتا ہوا جیسے نئے کیمپس کی عمارتوں کو سوکھے تنکے کی طرح بہا لے جائے گا۔ بادل کیا گرجیں گے جیسا اس رات پانی گرجا۔ کچھ لوگوں نے کھلے آسمان کے نیچے اذانیں دیں جو پانی کے شور میں دب گئیں۔

خوف کے مارے لوگ مکانوں کی چھتوں پر چڑھ گئے اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پہاڑوں کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے انہیں قصوروار ٹھہرا رہے ہوں یا ان سے التجا کر رہے ہوں کہ وہ کروٹ بدل لیں مگر دریا کی طرف بہنے والا سیلاب کبھی پلٹ کر میدانوں میں چڑھا ہے جو اس رات چڑھتا۔

ماؤں نے خالی جھولیاں پھیلا پھیلا کر دعائیں مانگیں۔ پانی اَور اوپر چڑھ آیا۔ ایک چھوٹی سی لڑکی نے کہا۔ ”اللہ میاں، اَور کچھ نہیں کرتا تو اجالا ہی کردے۔“

یہ دعا کام کر گئی۔ مشرق کے رخ بادل چھٹ گئے اور سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا۔

دن نکلا تو لوگ گھروں سے نکلے اور رات بھر کی تباہی کا جائزہ لینے لگے۔ ساری عمارتیں جوں کی توں کھڑی تھیں، درختوں کی جڑیں ننگی ہو گئی تھیں مگر وہ خود نہائے دھوئے کھڑے تھے۔ جگہ جگہ سے مٹی بہہ گئی تھی۔ نئی سڑکیں خود تو ثابت تھیں لیکن ان کے کناروں کو پانی کتر کر لے گیا تھا۔ اینٹ کے فرش حیرت انگیز طور پر سالم تھے اور پانی کی بڑی ٹنکی کے اونچے ستون سلامت تھے۔ قریب تھا کہ لوگ ٹھیکے دار کی دیانت داری کو داد دیں، کہیں سے شور اٹھا، سانپ سانپ کا شور۔ پھر کوارٹروں کی طرف سے یہی شور بلند ہوا۔ ذرا دیر بعد وائس چانسلر اپنے بنگلے سے سانپ سانپ کی صدا لگاتے ہوئے باہر نکلے۔ مارکیٹ کے پچھواڑے جو بڑا سا تالاب بن گیا تھا، لوگوں نے دیکھا کہ اس کی سطح پر مرے ہوئے سانپ تیر رہے ہیں اور ان کی لاشیں الٹ گئی ہیں اور ان کے سفید سفید پیٹ نظر آ رہے ہیں۔

کچھ دیر بعد خبر آئی کہ لڑکیوں کے ہاسٹل میں سانپ نکل آئے ہیں اور لڑکیاں غش کھا کھا کر گر رہی ہیں۔ یہاں تک تو غنیمت تھا۔ اگلی خبر یہ آئی کہ لڑکوں کے ہاسٹل میں سانپوں نے کئی لڑکوں کو ڈس لیا ہے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ انہیں اپنی کاروں میں ڈال کر اسپتال کی طرف دوڑے یہاں تک کہ دوڑنے والوں کا تانتا بندھ گیا۔

ادھر کچھ من چلوں کے ہاتھ ایک مشغلہ آیا اور انہوں نے سانپوں کو مارنا شروع کیا۔ شام تک خبر تھی کہ پچاس سانپ مارے گئے۔ وہ شمار کیے گئے تو مشکل سے پانچ نکلے۔ مگر اس کے بعد سانپ نظر آنے بند ہو گئے۔ کچھ دنوں بعد لوگ رود کوہی اور سانپ، دونوں کو بھول گئے، یہاں تک کہ پہلا تعلیمی سال ختم ہونے کو آیا۔

عین اُن دنوں جب امتحان ہو رہے تھے، جگہ جگہ سنپولئے نمودار ہونے لگے۔ نعمت خانوں میں، الماریوں کے نیچے، جوتوں کے اندر، اَور تو اَور چھینکوں کے اوپر سانپ نظر آنے لگے۔ کچھ نے لوگوں کو ڈسا، باقی کو لوگوں نے کچلا۔ غرض یہ کہ دونوں فوجیں ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے لڑتی رہیں اور یوں ہی کئی مہینے گزر گئے۔

ہر سال پہاڑوں کی طرف سے برساتی پانی کا ریلا آتا اور خود تو بہتا ہوا دریا میں اتر جاتا لیکن اپنے پیچھے سانپوں کا تحفہ چھوڑ جاتا۔ رفتہ رفتہ کیمپس میں بھانت بھانت کے سانپ پروان چڑھنے لگے اور ڈسے جانے کی وارداتیں معمول بننے لگیں مگر تشویش ناک معمول۔ کئی لڑکیاں مریں، کتنے ہی لڑکے جان سے گئے، یہاں تک کہ کنٹرولر، امتحانات ہلاک ہوئے اور حکام کا اجلاس بلانا پڑا تاکہ اس مسئلے کا کوئی حل نکالا جائے۔

اگلے روز اخبار میں اشتہار نکالا گیا۔ ''یونی ورسٹی میں ایک سپیرے کی آسامی خالی ہے۔ تجربے کار، خاندانی سپیرے درخواست دیں۔ سانپ پکڑنے کی مہارت ضروری ہے۔''

خیال تھا کہ دو چار درخواستیں آئیں گی لیکن شاید گریڈ ۹ کا چمتکار تھا یا غالباً مفت کوارٹر کی پیشکش کا اثر تھا کہ دور دور سے سپیرے پہنچنے لگے۔ بعض نے طالب علموں کو سانپ کا تماشا دکھا کر آنے جانے کا خرچ نکالنے کا وسیلہ پیدا کیا اور چند ایک نے گریڈے کے کوارٹروں سے کئی کئی سانپ پکڑ کر اپنی مہارت کی دھاک بٹھائی۔

آخر انٹرویو شروع ہوئے۔ زولوجی کے سارے استاد انٹرویو لینے بیٹھے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ سانپوں کے بارے میں امیدواروں کا علم

ان سے زیادہ ہے تو وہ اردو کے استادوں کا حق میں دست بردار ہو گئے۔ جب شعر و ادب کے حوالے سے سانپ کی خصلت اور تریاق کی خوبیوں پر اچھی طرح گفتگو ہو چکی تو عمر کوٹ سے آئے ہوئے شامی جوگی کو چن لیا گیا۔ وہ خود سپیرا تھا، اس کے باپ دادا سپیرے تھے اور اس کی بیوی کے ہاں جو بچہ ہونے والا تھا، شامی جوگی نے اعلان کر دیا کہ اگر لڑکا ہوا تو وہ بھی بڑا ہو کر سپیرا بنے گا۔

کچھ روز بعد شامی جوگی اپنی بین اور بیوی سمیت اپنے کوارٹر میں چلا آیا اور تینوں کی زندگی ہنستے گاتے گزرنے لگی۔ شامی بڑی مہارت سے سانپ پر ہاتھ ڈالتا تھا اور اُس کی دم پکڑ کر ایسا جھٹکا دیتا تھا کہ سانپ کی کمر ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔ سانپ کے تالو سے زہر نکالنے کا فن بھی اسے خوب آتا تھا۔ کئی بار تو یونی ورسٹی کے طالب علموں کے سامنے اس سے زہر نکالنے کا مظاہرہ کرایا گیا۔

گھاس کے سانپ، پانی کے سانپ اور زہریلے سانپ کو وہ دور ہی سے پہچان لیتا تھا اور سانپ کسی کو ڈس لے تو اس کے دانتوں کی خراش دیکھ کر ہی بتا دیتا تھا کہ سانپ زہریلا تھا یا نہیں اور مریض کو لے کر اسپتال کی طرف پیدل چلنا کافی ہو گا یا دوڑنے کی ضرورت ہے۔

سانپ کی ہڈیوں کے ہار وہ بڑی مہارت سے بناتا تھا۔ ہڈیوں کو رنگ دیتا تھا اور کہتا تھا کہ اس سے ہار خوش نما ہو جاتا ہے۔ جن بچوں کا سوتے میں پیشاب نکل جاتا تھا ان کے گلے میں یہ ہار ڈال دیا جاتا تو رات بھر چین سے سوتے تھے۔ وائس چانسلر کے باورچی نے ایک دن اس کا راز بیان کیا۔ ”سر جی، سانپ کی ہڈیوں سے جب بے بی لوگ کو خوف آتا ہے تو سارا

پیشاب دن ہی میں نکل جاتا ہے۔"

شامی جوگی نے اپنے کانوں میں جو بڑے بڑے مندرے ڈال رکھے تھے، خدا جانے یونی ورسٹی کی لڑکیوں کو ان کی کون سی ادا بھا گئی کہ انہوں نے یہ مندرے بطور فیشن اپنانے کا فیصلہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عمر کوٹ کے کاریگروں کو مندروں کے آرڈر پر آرڈر ملنے لگے اور کچھ دنوں بعد یوں لگتا تھا جیسے یہ کانوں کے مندرے طالبات کی یونی فارم کا حصہ ہیں۔

جس روز شامی جوگی کی بیوی اسپتال لے جائی گئی اور دوپہر تک اس کے ہاں بیٹے کی ولادت کی خبر آ گئی، اس شام مبارک باد دینے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ لڑکیوں کی فرمائش پر شامی جوگی نے اپنی بین پر رانو کی طرز بجائی اور جھینپ جھینپ کر لڑکیوں کو بتایا کہ اس کی پہلی محبوبہ کا نام رانی تھا۔

"آج تمہاری خاطر رانو بجائی ہے ورنہ کبھی نہ بجاتا۔"

لڑکیوں نے پوچھا۔ "کیوں؟"

جواب ملا۔ "بس۔"

شامی اپنے بیٹے کا نام اللہ دیار کھنے لگا لیکن شعبۂ اردو کی طالبات کہنے لگیں کہ یہ تو نہایت غیر ادبی نام ہے۔ انہوں نے پیچھے پڑ کر شامی کے بیٹے کا نام 'نامی' رکھوایا۔

اب سپیرے کا اپنے کام میں کم اور بیٹے میں زیادہ جی لگتا تھا۔ دن دن بھر وہ ننھے نامی کے ساتھ کھیلا کرتا، اس کے لئے جھنجھنا بجاتا لیکن بیٹا پھر بھی رونے سے باز نہ آتا تو وہ بین بجاتا اور وہ ذرا سا لڑکا اپنے بڑے بڑے کان کھڑے کر لیتا۔

کبھی کبھی شامی اسے ستاتا بھی تھا اور اُس ستانے میں اسے شاید کچھ

زیادہ ہی لطف آتا تھا۔ ہوتا یہ کہ بچہ خاموش لیٹا چھت کی کڑیوں کو دیکھ رہا ہوتا اور اس کے منہ میں چسنی لگی ہوتی۔ شامی دبے پاؤں آتا اور جس طرح جھپٹ کر سانپ پکڑا جاتا ہے اس طرح چسنی کو پکڑتا اور بچے کے منہ سے کھینچ لیتا۔ اس پر بچہ چیخ چیخ کر روتا، ہاتھ پاؤں چلاتا اور احتجاج کرتا۔ بیوی شوہر کو دوہتڑ رسید کرتی تو وہ جلدی سے بیٹے کے منہ میں چسنی دوبارہ لگا دیتا۔ لیکن آنکھ بچتے ہی پھر سے کھینچتا اور کہتا کہ منہ سے چسنی نکلنے کی جو آواز ہوتی ہے صرف اسے سننے کی خاطر وہ یہ سارا کھیل رچاتا ہے۔

شامی جوگی، اس کی بیوی، چھوٹے سے نامی اور پیتل کی میخوں سے سجی دھجی اس کی بین، چاروں کے دن گزرتے گئے۔

لیکن آنے والے مہینے اور برس اپنے ساتھ طرح طرح کے حالات لائے۔ مثلاً دریا پر جو پل بننا تھا وہ کیمپس کے سامنے سے گزرنے والی سڑک پر نہیں بلکہ کہیں اور بنا۔ سڑک ویران ہو گئی، یونی ورسٹی کی زمین کے دام زمین پر آرہے۔ اس کی مالی حالت خراب ہونے لگی اور زندگی طرح طرح کے وسوسوں میں دھنسنے لگی۔ چھوٹا سا نامی انگلی پکڑے بغیر چلنے لگا اور ماں کے چہرے پر افشاں سی چمکنے لگی۔ ملازموں کی چھانٹی ہونے لگی اور شامی جوگی کی جان سولی پر لٹکی لٹکی سی رہنے لگی۔

برساتی پانی کے ریلے کا آنا کبھی نہ رکا اور بہہ کر ساتھ آنے والے سانپوں کا آنا کبھی نہ تھما۔ ایک روز شامی کے بیٹے نے، جسے اب ساری یونیورسٹی نامی جوگی کہتی تھی، باپ کے جوتے پہن کر چلنے کی ٹھانی۔ کسی کو خبر نہ تھی کہ جوتے کے اندر ایک سانپ چھپا بیٹھا ہے۔ اس نے بچے کی ایڑی کو ڈسا اور نکل بھاگا۔ شامی جوگی نے چاہا کہ اسے پکڑ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے

کر دے لیکن ماں کی چیخ وپکار سے گھبرا کر اس نے سانپ کا پیچھا چھوڑا، بیٹے کو چارپائی پر اوندھا ڈالا اور اس کی چھوٹی سے کچھ سانولی، کچھ گلابی ایڑی میں ہونٹ پیوست کر کے اس شدت سے چوسا کہ اس کے جو گال پچکے ہوئے تھے وہ خون کے بڑے سے گھونٹ سے بھر گئے۔ اب جو اس نے سرخ خون کی کُلّی کی تو ماں نے گھبرا کر منہ پھیر لیا اور پڑوسیوں نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ بیٹا پانی پانی کی صدا لگانے لگا اور ڈاکٹر اس کی ایڑی کے زخم پر ٹنکچر کے پھائے رکھنے لگے۔

کچھ روز بعد ایک سانپ نے نامی کی ماں کے پیر کو ڈسنے کی کوشش کی مگر سندھ سے آئی ہوئی موٹے چمڑے کی جوتی نے ڈھال کا کام کیا۔ اس رات اس نے پہلی بار شامی جوگی سے کہا۔ "اب مجھے اس جگہ سے خوف آنے لگا ہے۔ میری مانو تو یہ نوکری چھوڑو اور عمر کوٹ واپس چلو۔"

اس رات شامی بہت ناراض ہوا۔ اس نے بیوی کو خوب ڈانٹا اور کہا۔ "گریڈ ۹ کی نوکری اور فری کا کوارٹر ساری عمر نہیں ملے گا۔"

اگلی صبح وہ بیوی پر خوب ہنسا کہ سپیرے کی بیوی ہو کر سانپوں سے ڈرتی ہے۔ سانپوں کے خوف سے یہ جگہ چھوڑی تو دنیا کیا کہے گی؟

یونی ورسٹی پر وہ پہلی جیسی شادابی نہیں رہی۔ وہ جو بڑے بڑے استاد اپنے علاقے کے خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اچھی اچھی لگی ہوئی نوکریاں چھوڑ آئے تھے وہ ایک ایک کر کے واپس جانے لگے۔

آخر ایک صبح وہی ہوا جس کا شامی کی بیوی کو ڈر تھا۔ شامی سو کر اٹھا اور اپنے جوتوں میں پیر ڈال رہا تھا کہ اندر بیٹھے ہوئے سانپ نے اس کی ایڑی کو بھنبھوڑ ڈالا۔ شامی 'ارے ظالم، ارے ظالم' کہتا رہ گیا اور سانپ دیکھتے دیکھتے

سامنے سے یوں نکل گیا جیسے تنی ہوئی کمان سے ابھی ابھی نکلا ہوا تیر۔

بیوی کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ”اب کیا ہو گا۔“

”کچھ نہیں ہو گا۔ ہرا تھا، گھاس کا تھا، کچھ نہیں ہو گا۔“

مگر بیوی آخر سپیرے کی بیوی تھی۔ سرمئی سانپ پر کالی دھاریاں وہ دیکھ چکی تھی اور اب شامی کے ماتھے سے پھوٹنے والے پسینے کے قطرے بھی دیکھ رہی تھی۔

وہ باہر کی طرف لپکی تو شامی چلایا۔ ”کہاں جا رہی ہے؟“

”ڈاکٹر کو بلانے۔“

”بیٹھ جا۔ بیٹھ جا۔ کسی ڈاکٹر واکٹر کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی گھڑی بھر میں اچھا ہو جاؤں گا۔ دیکھ تیر الٹر کا روئے جا رہا ہے بلاوجہ۔ اس کے منہ میں چسنی لگا۔“ یہ کہتے کہتے شامی جوگی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور منہ سوکھنے لگا۔

”تمہیں تو کچھ ہو رہا ہے۔“

”کچھ نہیں ہو رہا ہے، گھاس کا سانپ تھا، کچھ نہیں ہو گا۔“

”ہو یا نہ ہو۔ میں تو ڈاکٹر کو بلانے جا رہی ہوں۔“

”خبردار۔“

”کیوں۔“

”دنیا ہنسے گی کہ اتنا بڑا سپیرا ڈاکٹر کو بلا رہا ہے۔“

”ہنسنے دو دنیا کو۔“

”اچھا پہلے مجھے پانی پلا۔ بڑے زور کی پیاس لگی ہے۔“

”یہ تو زہر چڑھ رہا ہے۔ میں جاتی ہوں ڈاکٹر کو بلانے۔“

"خبردار، خبردار۔ چولہے میں لوہا گرم کر کے زخم پے رکھ دے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔"

"نہیں ہو گا۔ میں سامنے والے پروفیسر کو خبر کرنے جا رہی ہوں۔"

"آہاں۔ یہ مت کرنا۔"

"کیوں۔" اب بیوی رونے لگی۔

"یہ لوگ مجھے نوکری سے نکال دیں گے۔" یہ کہتے کہتے شامی جوگی کی آنکھوں کے گوشے بھیگ سے گئے۔

"جان زیادہ پیاری ہے یا نوکری؟" بیوی روتے روتے چیخی۔

"نوکری۔" یہ کہہ کر شامی نے سر ڈھلکا دیا اور سہمے ہوئے بیٹے کو دیکھنے لگا۔ بیوی نے جلدی سے چادر اوڑھی اور لپک کر باہر نکل گئی۔ سامنے سڑک پر ٹریفک کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ وہ بے صبری سے انتظار کرنے لگی کہ کاریں رکیں تو سڑک پار کرے کہ اچانک کوارٹر کے اندر سے بین کی آواز آئی۔ وہ سہم سی گئی۔ شامی جوگی بین پر رانو کی دھن بجا رہا تھا۔

اس نے کئی بار چاہا کہ کاروں کے درمیان سے گزر جائے لیکن کہیں وقفہ آتا تو وہ گزرتی۔ بین کی آواز اس کے کانوں کو اندر تک چھیدنے لگی۔ رانو کی طرز میں درد بھرا ہوا تھا۔ ایک بار تو اسے یوں لگا کہ بین رو رہی ہے۔ یک لخت بین بجنی بند ہو گئی۔ بالکل اچانک اور بالکل یوں جیسے چھت کی کڑیاں دیکھنے والے کسی بچے کے منہ سے اس کی چسنی کھینچ لی جائے۔

یک بیک سارا ٹریفک گزر گیا۔ سڑک ویران ہو گئی۔ سرمئی سڑک جس پر کالی دھاریاں تھیں اب شامی کی بیوی کو پار اتر جانے کی دعوت

دے رہی تھی لیکن اب اس کا جی چاہا کہ سڑک کی دم پکڑ کر ایسا جھٹکا دے کہ سڑک کی ہڈی ٹوٹنے کی آواز صاف سنائی دے۔

مگر وہ اپنے ٹوٹے ہوئے گریڈ ۹ کو اٹھائے کوارٹر میں لوٹ آئی۔

فری کے کوارٹر میں۔

جان صاحب

جاڑوں کا زور ٹوٹ رہا تھا اور پورا ریلوے اسٹیشن دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ سورج بس ایسی منزل پر تھا جیسے سوچ رہا ہو کہ نکلے یا نہ نکلے۔ اتنے میں ٹرین آکر رکی تو وردی کی لال قمیصیں اور میلے پاجامے پہنے اور موٹی موٹی چادریں لپیٹے ہوئے قلی ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ انہیں ایسے مسافروں کی تلاش تھی جو اپنے ساتھ مال اسباب لائے ہوں۔ انہوں نے اس جوان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا جو خالی ہاتھ اترا اور پلیٹ فارم پر لوہے کے کھمبے سے ٹیک لگا کر یوں بیٹھ گیا جیسے اب تمام عمر اسے یہیں بیٹھنا ہے۔

دھند اتنی گہری تھی کہ صبح کا ہونا ملتوی سا ہو گیا تھا۔ کہرے کے بادل فضا سے اتر کر پلیٹ فارم کے سائبان کے اندر چلے آرہے تھے۔ لیمپوں کی پھیکی پھیکی روشنی میں لوگوں کی سانسوں کے ساتھ نکلنے والی بھاپ کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ کچھ دیر بعد ٹرین جیسی دھند میں سے نکل کر آئی تھی، ویسی ہی دھند میں جا کر گم ہو گئی۔

اور جب دن کا اجالا ہوا تو خاکروبوں نے دیکھا کہ ایک شخص کھمبے سے ٹیک لگائے سو رہا ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں، کپڑے میلے ہیں اور پیروں سے جوتے غائب ہیں۔

کچھ دیر بعد ٹکٹ کلکٹروں کی ٹولی وردیاں پہنے اور ادھوری نیند کی شکایت کرنے والی آنکھیں ملتے ڈیوٹی پر پہنچی۔ چائے کے اسٹالوں پر انگیٹھیاں دہک چکی تھیں، پانی کھول رہا تھا اور ابلتے دودھ سے اٹھتی سفید سفید بھاپ کی خوش بو پھیل رہی تھی۔

ایک ٹکٹ کلکٹر فرش پر بیٹھے ہوئے جوان کے قریب پہنچا اور اس سے پوچھا کہ وہ کون ہے، کہاں سے آیا ہے، کہاں جا رہا ہے اور اس کا ٹکٹ کہاں ہے۔ نوجوان ہر سوال کے جواب میں مسکرا دیا اور وہ بھی احمقوں کی طرح۔ ذرا دیر میں کئی ٹکٹ کلکٹر اس کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہوئے اور اس نتیجے پر پہنچے کہ وہ نہ صرف گونگا اور بہرا ہے بلکہ دیوانہ بھی ہے۔ ایک ذرا بے تکلف ٹکٹ کلکٹر نے اس سے پوچھا۔ "کہاں سے آئے ہو میری جان۔"

اس سوال پر وہ مسکرایا نہیں بلکہ کھلکھلا دیا۔ بس اسی وقت سے اس کا نام جان ہو گیا۔ ایک شخص نے چائے والے کو آواز دی۔ "لاؤ بھئی، جان صاحب کے لئے چائے اور پاپے لاؤ۔" نوجوان نے کچھ کھایا اور کچھ چھوڑ دیا اور کچھ اس کے منہ پر لگا رہ گیا۔

رات جو لوگ حاجیوں کو لینے اسٹیشن آئے تھے اور باسی پھولوں کے ہار پلیٹ فارم پر چھوڑ گئے تھے، کچھ لڑکوں نے وہ ہار اٹھا کر اور سلجھا کر جان کے گلے میں ڈال دیئے اور قہقہے لگانے لگے۔ وہاں موجود لوگوں نے زور زور سے تالیاں بجائیں اور کہنے لگے کہ جان صاحب، بالکل دولہا لگ رہے ہو۔ اس بات پر مسکراتے ہوئے جان صاحب کھلکھلانے لگے اور بہت محظوظ ہوئے۔ ایک بوڑھا قلی بولا کہ یہ بہرا نہیں لگتا۔ اس پر نوجوانوں کی ٹولی نعرے لگانے لگی: بہرا ہے بھئی بہرا ہے۔

اس دوران ٹکٹ کلکٹروں نے جان صاحب کو اپنی حفاظت میں لے لیا۔ دیکھتے دیکھتے جان صاحب اسٹیشن کا ایک حصہ بن گئے۔ ان پر کوئی روک تھام نہیں تھی۔ وہ دن بھر پٹریوں اور پلیٹ فارموں پر گھوما کرتے۔ اُس پار جانے والے پل پر ڈیرا ڈال دیتے اور آتے جاتے مسافر کبھی انہیں چھیڑتے، کبھی ستاتے، کبھی ان کے گونگے پن سے لطف اٹھاتے اور کبھی ان کی جیب میں نوٹ ٹھونس جاتے۔ جان صاحب ہر بات پر مسکرا کر رہ جاتے۔

ایک روز پلیٹ فارم پر سناٹا تھا اور جان صاحب اسٹیشن کے نل کی ٹونٹی سے آبشار کی طرح بہنے والے پانی کے نیچے اپنا ایک ہاتھ پھیلائے ہتھیلی پر پانی گرنے کا تماشا دیکھنے میں مصروف تھے کہ ایک پولیس والا ان کے پاس آیا، ان سے کچھ کہا اور ان کی قمیص کی جیب میں بھرے ہوئے نوٹ نکال کر گنے۔ شاید ایک سو تین روپے تھے۔ پولیس والے نے تین روپے جان صاحب کی جیب میں اور باقی اپنی جیب میں ٹھونسے اور چلتا بنا۔ اسٹیشن سے باہر نکل کر اس نے ایک موٹر سائیکل سوار کو روکا اور اس کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر سری پائے والے کی دکان پر چلنے کا حکم دیا۔

موٹر سائیکل چند قدم آگے جا کر سڑک پر پھیلے ہوئے تیل پر پھسل گئی۔ سوار تو کپڑے جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا البتہ سپاہی وہیں پڑا رہا اور اس کے سر سے خون بہنے لگا۔ دوسرے پولیس والے اسے تانگے میں ڈال کر اسپتال لے گئے لیکن اس کے سو روپے کے مڑے تڑے نوٹ وہیں پڑے رہ گئے۔ جو لوگ شروع سے آخر تک یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے انہوں نے وہ نوٹ اٹھائے اور واپس جا کر جان صاحب کی جیب میں اُڑس دیئے۔ دوپہر تک خبر آئی کہ سپاہی پر غشی طاری ہے اور وہ کسی طرح ہوش میں نہیں آرہا ہے۔

اس کے بعد کسی نے جان صاحب کے جیب سے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں لی۔

اس شام ٹکٹ کلکٹروں نے ان کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا مگر وہ پلیٹ فارم پر جم کر بیٹھ گئے اور روٹھے ہوئے بچے کی طرح جانے سے انکار کرتے رہے۔

اگلی صبح پورے علاقے میں ایک خبر گشت کر رہی تھی۔ رات کو جان صاحب فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ ایک بوڑھا قلی آکر ان کے پاس بیٹھ گیا اور باتیں کرنے لگا۔ جان صاحب اس کی ہر بات پر مسکرا دیتے۔ ہوتے ہوتے قلی ان کی ٹانگیں دبانے لگا۔ وہ خاموشی سے لیٹے اپنی ٹانگیں دبواتے رہے۔ صبح بوڑھے قلی نے اعلان کر دیا کہ اس کے ساتھ عجب واقعہ ہوا ہے اور اس کے دونوں ہاتھوں میں بہت عرصے سے جو رعشہ تھا، جان صاحب کی ٹانگیں دباتے دباتے وہ رعشہ جاتا رہا ہے۔

چائے والے کی بیوی کے آدھے سر میں قیامت کا درد اٹھتا تھا۔ اس روز وہ جان صاحب کو چائے پلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ جان صاحب نے بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر دیا۔ وہ دن اور آج کا دن، پھر اس عورت کے سر میں ذرا سا بھی درد نہیں اٹھا۔ یہ بات وہ ایک ایک سے کہتی پھری۔

اسی دوران آتے جاتے مسافروں سے جان صاحب کے بارے میں دو چار باتیں معلوم ہوئیں۔ کسی نے بتایا کہ یہ کراچی کے ایک خوش حال گھرانے کا فرد ہے۔ وہ لوگ پیسے والے ہیں لیکن یہ دیوانہ ہو کر گھر سے نکل گیا ہے۔

جان صاحب اسٹیشن سے قدم نہ نکالتے لیکن پلیٹ فارموں پر جدھر سر اٹھتا، ادھر ہی نکل جاتے۔ اب ہر شخص انہیں جان گیا تھا۔ ہر طرف سے آوازیں لگتیں: 'کیا حال ہے جان صاحب۔ ارے کچھ کھالو ورنہ بھوکے مر جاؤ گے۔ بڑا جاڑا ہے، کچھ اوڑھ لو جان صاحب'۔ اور ہر صدا کے جواب میں جان صاحب مسکرا دیتے۔ کسی نے کہا کہ یہ سوالوں کا جواب کیوں نہیں دیتا۔ دوسرے نے کہا کہ کان بیکار ہیں بے چارے کے۔ سنے گا تو جواب دے گا۔

ایک روز جان صاحب پلیٹ فارم پر بیٹھے تھے اور کچھ لوگ ان کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ اتنے میں ریجنل آفس کے کوئی ڈائرکٹر صاحب ادھر آ نکلے۔ کچھ دیر تو وہ دور کھڑے یہ منظر دیکھتے رہے۔ پھر ایک ٹکٹ کلکٹر کو بلا کر کچھ پوچھا۔ دور سے محسوس ہو رہا تھا کہ افسر صاحب کچھ سخت ہدایتیں دے رہے ہیں اور ٹکٹ کلکٹر جان صاحب کی صفائی پیش کر رہا ہے۔ آخر افسر جان صاحب کے قریب آئے اور غالباً سابق فوجی تھے، اس لئے فوجیوں کے انداز میں مجمع کو حکم دیا کہ جان صاحب کو اٹھا کر اسٹیشن کے علاقے سے باہر پھینک دیا جائے۔ مجمع یہ سن کر خاموش ہو گیا اور بڑے افسر پریڈ کے انداز میں چلتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ وہ پُل پر چڑھ رہے تھے کہ ان کی ٹانگ پھسلی اور اس طرح گرے کہ آٹھ سیڑھیوں پر ان کی ٹھڈی نے آٹھ جھٹکے کھائے۔ اسٹیشن کا عملہ مرہم پٹی کا سامان لے کر دوڑا۔ دیر تک لوگ ان کا دوا علاج کرتے رہے اور نہ معلوم کیا کہتے رہے، البتہ افسر صاحب بار بار گردن اونچی کر کے جان صاحب کو دیکھتے رہے۔ پھر وہ کبھی یہ پوچھنے نہیں آئے کہ اس دیوانے کو اٹھا کر دور پھینکا گیا یا نہیں۔

یقین سے نہیں معلوم لیکن کہتے ہیں کہ ایک روز سٹّہ کھلانے والا ایک شخص دیر تک جان صاحب کا سر دباتا رہا۔ وہ خود بتاتا ہے کہ جان صاحب نے بالآخر اسے چار انگلیاں دکھائیں اور اس رات وہ لکھ پتی ہو گیا۔

پھر تو اس طرح کی کہانیوں کا سیلاب آ گیا۔ کسی شخص کو مقدمہ ہار جانے کا یقین تھا۔ جان صاحب نے اسے سینے سے لگا لیا۔ اگلے روز عدالت کا فیصلہ اس کے حق میں ہوا۔

اُسی بوڑھے قلی کا لڑکا ہر سال فیل ہو جاتا تھا۔ ایک روز جان صاحب نے اس کا ماتھا چوم لیا۔ کہتے ہیں کہ لڑکا دفعتاً بلا کا ذہین ہو گیا۔

یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اسٹیشن کا عملہ جان صاحب کی دیکھ بھال اور اسٹال والے خدمت کرتے رہے۔ کسی نے چاہا کہ انہیں لے جا کر اپنے گھر میں رکھے اور جی لگا کر خدمت کرے لیکن جان صاحب کبھی کہیں جانے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

ایک رات شہر میں کوئی بڑا عرس تھا۔ محفلِ سماع اور لنگر شریف کی بڑی تیاریاں تھیں۔ عرس کے منتظمین نے لاکھ چاہا کہ جان صاحب چل کر اپنے ہاتھ سے چادر چڑھا دیں لیکن وہ پلیٹ فارم کے کھمبے سے چمٹ گئے مگر ان لوگوں کے ساتھ نہیں گئے۔

کچھ عرصے بعد لوگوں نے دیکھا کہ سفید لباس پہنے، سفید ٹوپیاں منڈھے، بال جمائے، آنکھوں میں سرمہ اور کانوں میں عطر کے پھوہے لگائے کچھ لوگوں نے جان صاحب کے پاس آنا جانا شروع کر دیا ہے۔ کبھی لڑکے آتے ہیں اور کبھی بزرگ اور جان صاحب کے کان میں خدا جانے کیا کیا کہتے رہتے ہیں اور چلتے وقت ان کی مٹھی میں بہت سے نوٹ دبا جاتے ہیں۔

ایک روز قلیوں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ وہ خبر لائے کہ یہ مزار مافیا والے ہیں جو جان صاحب کو اپنے آستانے پر لے جانے اور بعد میں ان کا مزار بنانے کے پھیر میں ہیں۔

اگلے روز اسی قبیل کا ایک بوڑھا شخص شاندار کار میں بیٹھ کر آیا اور کہنے والے کہتے ہیں کہ جان صاحب کو ورغلانے لگا۔ قلیوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور اس کی جھلملاتی کار پر پتھراؤ شروع کر دیا۔ وہ جیسے تیسے جان بچا کر بھاگا اور پھر کبھی نہیں آیا۔

یوں ہی وقت گزرتا گیا۔ جان صاحب کی حجامت بنانے والے نائی کہنے لگے کہ جان صاحب، آپ کی ڈاڑھی میں سفید بال جھلکنے لگے ہیں۔ اس بات پر وہ احمقوں کی طرح مسکرا دیتے اور ہمیشہ کی طرح چپ رہتے۔

لیکن رفتہ رفتہ یہ ہوا کہ ان کی مسکراہٹیں کم ہونے لگیں اور چپ بڑھنے لگی۔ وہ کئی کئی روز سخت فرش پر لیٹے رہتے یا کہیں آڑ میں جا کر بیٹھ جاتے اور باہر نہ نکلتے۔ پہلے تو وہ شیو بنوا لیا کرتے تھے اور لوگ انہیں نہلا کر کپڑے بدلتے تو چپ چاپ بدلوا لیا کرتے تھے مگر اب وہ انکار اور مزاحمت کرنے لگے۔

البتہ وہ رات کو آنے والی گاڑی کے وقت اسی پلیٹ فارم پر جا بیٹھتے جس پر گاڑی لگا کرتی تھی۔ مسافروں کا ریلا آتا، چلا جاتا اور سناٹا چھا جاتا۔

جاڑوں کا زور ٹوٹ رہا تھا اور اس صبح پورا اسٹیشن دھند میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگ کام پر آئے تو دیکھا کہ ہر چیز اپنی جگہ موجود ہے مگر جان صاحب غائب ہیں۔ پلیٹ فارم پر وہ جگہ خالی پڑی تھی جہاں وہ صبح کے وقت اونگھتے ہوئے ملا کرتے تھے۔ ٹی اسٹال والوں نے لپک لپک کر وہ تمام جگہیں دیکھنی

شروع کیں جہاں جان صاحب موجود ہو سکتے تھے مگر وہ کہیں نہ تھے۔

ذرا دیر بعد ایک فقرہ اِدھر سے اُدھر تک دوڑ گیا: جان صاحب چلے گئے۔

ہر ایک کی زبان پر ایک ہی سوال تھا: کہاں چلے گئے، کیسے چلے گئے۔

دوپہر ہونے سے پہلے پہلے بوڑھا قلی کام پر آیا تو ٹکٹ کلکٹروں نے اسے گھیر لیا۔ "تم نے جان صاحب کو دیکھا؟ کچھ معلوم ہے جان صاحب کہاں گئے؟"

قلی کا ہاں کہنا تھا کہ ہر طرف سے لوگ اس کی طرف بڑھنے لگے اور اچھا خاصا مجمع قلی کو گھیر کر کھڑا ہو گیا۔ "کہاں گئے جان صاحب؟"

بوڑھا قلی بولا۔ "رات میں پلیٹ فارم پر تھا۔ بڑی گہری دھند تھی۔ اس میں گاڑی آکر جوں ہی رکی، ایک عورت نیچے اتری اور دھند میں غور سے ادھر ادھر کچھ ڈھونڈنے لگی۔ کون عورت تھی، کچھ پتہ نہیں۔ اس نے اوپر سے نیچے تک سیاہ شال اوڑھ رکھی تھی۔ لیمپوں کی روشنی میں اس کا اجلا سا چہرہ اور اس پر بکھری ہوئی لٹیں نظر آئیں۔ اچانک اس نے دھند میں جان صاحب کا سایہ دیکھا، اور پھر پتہ ہے کیا ہوا؟"

سارا مجمع بولا۔ "کیا ہوا؟"

قلی نے کہا۔ "وہ عورت جان صاحب کی طرف دوڑی۔ جان صاحب اسے اپنی جانب آتا دیکھ کر کھڑے ہوگئے اور پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے بولے: جان؟ وہ قریب آئی اور جان صاحب کے دونوں رخساروں پر ہاتھ پھیرے۔ جان صاحب نے بھی اس کے چہرے کو یوں چھوا جیسے کوئی اندھا کسی چیز کو ٹٹول کر محسوس کرتا ہے۔ وہ جان صاحب کا ہاتھ

تھام کر اپنے ڈبے کی طرف واپس چلی۔ جان صاحب اس کے پیچھے پیچھے چلتے گئے اور اس کے ساتھ ریل کے ڈبے میں داخل ہو گئے۔ دروازہ بند ہوا اور گاڑی جیسی دھند میں چلتی ہوئی آئی تھی، ویسی ہی دھند میں چلتی ہوئی غائب ہو گئی۔ جان صاحب اس عورت کے ساتھ چلے گئے۔"

مجمع خاموش کھڑا سن رہا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کہے۔ آخر ایک ٹکٹ کلکٹر نے پوچھا۔ "تو یہ قصہ کیا تھا؟"

بوڑھا قلی بولا۔ "میرا خیال ہے عاشق تھی۔"

کسی نے کہا۔ "مگر پھر یہ کرامات کہاں سے آئیں؟"

بوڑھا قلی بولا۔ "عشق سے۔"

چوہدری عبدالہادی کا آختہ

میں بتاتا ہوں کہ اسرار کہاں گیا۔ لیکن پہلے آپ کو اسرار کا پورا قصہ سننا ہوگا۔

اُس کے باپ سرکار احمد کی تنہائی کو جب بہت عرصہ گزر گیا تو دوست اس کے پیچھے پڑے اور وہ دوسری شادی کرنے پر رضامند ہو گیا۔

لڑکی والوں کا اصرار تھا کہ اُسے خود آکر سسرال میں رہنا ہوگا، ہاں اپنے بیٹے اسرار کو وہ ساتھ لا سکے گا۔

یہ بھی طے پایا کہ سسرال والے اسرار کو گھر کا لڑکا تصور کریں گے اور اسی طرح اس کی نئی بیوی کے پہلے شوہر سے جو دو لڑکے ہیں، سرکار احمد انہیں اپنے بیٹے تصور کرے گا۔

بعد میں کچھ لوگوں نے بہت کہا کہ سرکار احمد نے اس طرح کی شرطیں مان کر حماقت کی اور اسے یہ کرنا چاہئے تھا، وہ کرنا چاہئے تھا۔ مگر سرکار احمد نے معاملات پر اچھی طرح غور کر لیا تھا۔ اس کے سامنے فلاح کی یہی ایک راہ تھی۔ اسے یہ اطمینان تھا کہ اسرار کو رہنے کا ٹھکانا مل جائے گا جہاں وہ جی لگا کر پڑھے لکھے گا اور بڑا آدمی بنے گا۔

دوسری بیوی کا نہ صرف گھرانا بلکہ اس کی پوری بستی قبائلی

رواجوں پر قائم تھی۔ ان کے دستور جتنے پرانے تھے اتنے ہی نرالے بھی تھے۔ سرکار احمد کو یقین تھا کہ ہونہار بیٹا کچھ تو خود کو اس رنگ میں ڈھال لے گا، کچھ اپنی ذہانت سے ان لوگوں کی طینت بدل دے گا۔

آخر شادی ہوئی۔ سرکار احمد اور اسرار اپنا تھوڑا بہت مال اسباب لے کر رحمتی منتقل ہو گئے۔ اسرار کہا کرتا تھا کہ اَور کچھ ہو یا نہ ہو، بستی کا نام اچھا ہے۔

بستی بھی کچھ ایسی بری نہ تھی۔ شروع شروع میں دونوں کی خوب آؤ بھگت ہوئی۔ محدود وسائل میں زندگی کی جتنی آسائشیں ممکن تھیں، مہیا کر دی گئیں۔ اسرار نے اپنی تعلیم جاری رکھی البتہ اسے یہ دکھ ستانے لگا کہ یہ جو اسے دو بھائی ملے ہیں، یہ دو تین جماعتیں پڑھ کر گھر بیٹھ رہے ہیں۔ ہر وقت یا تو چائے پیتے رہتے ہیں یا پان کھاتے رہتے ہیں۔ ریڈیو کے فرمائشی پروگرام میں خط لکھتے رہتے ہیں۔ فلمی گانے گاتے رہتے ہیں اور خود بھی تک بندی کرتے کرتے شاعر بن بیٹھے ہیں۔ ایک نے اپنا نام زخمی رکھ لیا ہے اور دوسرے نے بے بس۔ صرف یہی نہیں، زخمی کی شادی کی بات چیت چل رہی ہے، کوئی پڑھی لکھی لڑکی بیاہ کر گھر میں آنے والی ہے۔

پھر ایک اَور دکھ نے اسے آن دبوچا۔ باپ ایک روز بیٹھے بیٹھے مر گیا۔ اسے اس ٹیلے کے اوپر دفن کیا گیا جہاں ہری سنگھ نلوا سے جنگ کرنے والے شہید دفن تھے۔ بستی میں سوگ بھی منایا گیا اور سرکار احمد کا مزار تعمیر کرنے کے لئے ہاتھ کے ہاتھ چندا بھی جمع ہونے لگا۔

اوپر سے غضب یہ ہوا کہ اسرار کے ساتھ گھر والوں کے سلوک میں فرق آنے لگا۔ وہ ذہین بھی تھا۔ محنتی بھی تھا۔ اب تو ملازمت کر کے

اچھی بھلی رقم بھی گھر میں لانے لگا تھا مگر مشکل یہ تھی کہ وہ سب سے جدا تھا، اوروں سے مختلف تھا۔ کچھ تو وہ خودداری کہیں سے لے آیا تھا۔ کچھ یہ کہ غلط بات کو غلط کہہ دیتا تھا۔

بستی کے طور طریقوں کے کھانچے میں اس کے یہ انداز ٹھیک طرح سے نہ بیٹھ سکے۔ کبھی اس نے کہہ دیا کہ چھت کے اوپر گھاس بہت اگ آئی ہے، زخمی اور بے بس دن بھر بیکار بیٹھے رہتے ہیں۔ ان سے کہا جائے کہ چھت پر چڑھیں اور گھاس اکھاڑیں۔ اس پر بھائی روٹھے سو روٹھے، ماں بھی برہم ہو گئی اور لگی طرح طرح کے طعنے دینے۔

وہ جب مہینے بھر کی تنخواہ لا کر ماں کے ہاتھ پر رکھتا تو فوراً لے لی جاتی لیکن جب کہتا کہ دیئے کی روشنی میں اس سے پڑھا نہیں جاتا، اسے لالٹین دلوا دی جائے تو بستی کے چوہدری سے شکایت کی جاتی کہ ماں کو سوتیلی سمجھنے لگا ہے۔

ایک روز اس نے کہا کہ تکیئے کا غلاف بہت میلا ہو گیا ہے، اسے دھلوا دیا جائے تو اگلے روز دفتر سے واپسی پر جب چوہدری عبدالہادی راہ میں ملے تو کہنے لگے کہ سنا ہے تم آمادۂ بغاوت ہو۔

اسرار نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ سمجھا کہ شاید اس کی پشت پر کوئی اَور کھڑا ہے اور چوہدری صاحب اس سے مخاطب ہیں۔

چوہدری صاحب کبھی فوج میں رہ چکے تھے اور محاذ پر بھی جا چکے تھے۔ بم کا ایک ٹکڑا اڑ کر ان کے گال کو کاٹ گیا تھا۔ کسی اناڑی ڈاکٹر نے کٹے ہوئے گال کو چٹکی میں پکڑ کر یوں ٹانکے لگا دیئے تھے جیسے موچی جوتا گانٹھتا ہے۔ اب اس کا بدہیئت نشان باقی تھا۔ چوہدری صاحب کسی کے سامنے آتے

تو نگاہ ان سے پہلے ان کے گال پر پڑتی تھی۔

چوہدری صاحب بایاں ہاتھ چلا چلا کر باتیں کرتے تھے۔ دایاں ہاتھ ان کے پتلون کی جیب میں اتنا زیادہ پڑا رہتا تھا کہ زین کے پتلون کی ایک جیب بری طرح میلی ہو چکی تھی اور دوسری بالکل اجلی تھی۔

اسرار سے بولے کہ سنا ہے تم باغی ہو گئے ہو اور آمادۂ فساد ہو۔ سنا ہے کہ بڑے بڑے مطالبے کرنے لگے ہو اور چاہتے ہو کہ ماں تمہارے لئے بھی وہی سب کرے جو اپنے اصل فرزندوں کے لئے کرتی ہے۔ ٹھیک ہے، بہت قابل ہو لیکن اگر ساری مراعات تم لے لو گے تو بچارے ان یتیم لڑکوں کو کیا ملے گا؟

غضب یہ ہوا کہ اسرار انہیں اپنی بات سمجھانے لگا۔ بات ابھی جاری تھی کہ چوہدری عبدالہادی کے اندر کا ریٹائرڈ فوجی ڈیوٹی پر حاضر ہونے کے لئے مچلنے لگا۔

اسرار رخصت ہونے لگا تو بڑے ادب سے بولا۔ "خدا حافظ۔"

وہ اُتنے ہی کڑک کر بولے۔ "اللہ حافظ۔"

اس کے بعد یوں لگا کہ پہلی تاریخ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ادھر اسرار نے تنخواہ لا کر ماں کی اس ہتھیلی پر رکھی جس کی لکیریں اندر سے اس طرح کالی تھیں جیسے ان میں میل بھرا ہو، اُدھر چوہدری عبدالہادی نے بگل بجا دیا۔ اعلان ہوا کہ اسرار سرکش ہو گیا ہے۔ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے پنچایت بیٹھ رہی ہے۔

پنچایت بیٹھی۔ اسرار یہ سوچ کر گیا کہ پہلے اس کا بیان سنا جائے گا۔ وہ بے شمار باتیں طے کر کے گیا۔ یہ پوچھا جائے گا تو یہ کہوں گا، یہ سوال

ہو گا تو یوں جواب دوں گا۔

وہاں پہنچا تو پتہ چلا کہ پنچایت اُس کا بیان سننے کے لئے نہیں بلکہ اپنا فیصلہ سنانے کے لئے بیٹھی تھی۔ اس روز اس نے پہلی بار دیکھا کہ چوہدری عبدالہادی کا دایاں ہاتھ کلائی تک کٹا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ میدانِ جنگ میں بارودی سرنگ کو ناکارہ بنا رہے تھے، مگر پہلے سرنگ کا داؤ لگ گیا۔

فیصلہ سنا دیا گیا۔ چوہدری صاحب نے کہا کہ اسرار شادی شدہ ہوتا تو اس کا نکاح فسخ کر دیا جاتا۔ ایسے موٹے موٹے لفظ اسرار نے پہلے کبھی نہیں سنے تھے۔ اب چونکہ وہ کنوارا تھا اس لئے قبیلے کی پرانی رسم کے مطابق اسے سرکشی، فساد اور بغاوت کی یہ سزا دی جائے گی کہ پورے ایک مہینے تمام قبیلہ یوں تصور کرے گا جیسے اسرار کسی کو نظر ہی نہیں آرہا ہے۔ وہ بستی میں رہے گا، گھر میں ہی رہے گا لیکن گھر والے اور بستی والے اوّل تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھیں گے نہیں اور اگر دیکھیں گے تو یوں جیسے وہ وہاں ہے ہی نہیں۔

چوہدری عبدالہادی نے جوں ہے اپنا کٹا ہوا ہاتھ دوبارہ جیب میں ڈالا، یوں لگا کہ کسی بڑے سیشن جج نے سزائے موت کے حکم پر دستخط کر کے اپنا قلم توڑ ڈالا ہو۔ فوراً ہی فیصلے پر عملدرآمد شروع ہو گیا۔ اسرار ابھی وہاں تھا، ابھی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

راستے میں فتّو فقیرنی ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھی۔ وہی ہاتھ جس میں ایک لے دے کر اسرار ہی چونّی ڈالا کرتا تھا۔ اسرار کو دیکھتے ہی فتّو نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ پٹواری ملا جس کا نام شاید فضل یا افضل تھا، اس نے اسرار پر یوں نگاہ ڈالی جیسے اسے نہیں بلکہ اس کے اندر سے دور تک دیکھ رہا ہو۔ رحمت حلوائی کی نگاہ دودھ کے کڑھاؤ سے اٹھنے والی بھاپ پر تو ٹھہر گئی مگر

اسرار پر نہ ٹھہر سکی۔ غلام محمد ہومیوپیتھ چھڑی ٹیکے ہوئے جا رہے تھے۔ زمین سے ابھری ہوئی پرانے درخت کی جڑ سے الجھ کر گر پڑے لیکن اٹھنے کے لئے اسرار کا سہارا قبول نہیں کیا بلکہ بے بسی سے قریب کھڑی ہوئی بکری کو یوں دیکھنے لگے جیسے وہ جا کر کسی شخص کو بلا لائے گی، کسی تابعدار، فرماں بردار، کسی نظر آنے والے شخص کو۔

اسرار گھر میں داخل ہوا تو ماں دیواروں کو دیکھنے لگی۔ زخمی زور زور سے کوئی گانا گانے لگا۔ بے بس فلمی رسالہ کھول کر تصویریں دیکھنے لگا۔ ملازمہ سر جھکا کر جلدی جلدی جھاڑو دینے لگی۔ صرف زخمی کی بیوی قریب سے گزری تو اسرار کو محسوس ہوا کہ وہ کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہی ہے۔ وہ گزر گئی اور سوندھی مٹی سے ملتی جلتی اس کے عطر کی خوش بو وہاں رہ گئی۔

سامنے والے مکان سے نوکر کو بلایا گیا جس نے آکر اسرار کے سامنے کھانا رکھا مگر وہ بھی اسرار کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے خلا کو دیکھ رہا ہو۔ کھانا سامنے رکھ کر اور پانی دیئے بغیر وہ تو چلتا بنا، اسرار نے جوں توں کر کے کچھ لقمے نگلے اور منہ ہاتھ دھونے انگنائی میں چلا گیا۔ واپس آیا تو تپائی پر پانی سے بھرا ہوا گلاس رکھا تھا اور ہوا میں سوندھی مٹی کی خوش بو تھی۔

صبح وہ کام پر جانے لگا، کسی نے اسے رخصت نہیں کیا۔ راہ میں جو بھی ملا اس پر اچٹتی سی نگاہ ڈال کر رہ گیا۔ کنویں کے قریب جو چتکبرا کتا اس پر بھونکتا تھا وہ بھی آنکھیں میچے بیٹھا رہا۔

آخر جب لاری آئی اور اسرار اس میں بیٹھا اور آگے کہیں سے آنے والے مسافروں نے اسے سلام کیا تو اس نے حیران ہو کر اپنے ہاتھوں کو دیکھا۔ وہ صاف نظر آ رہے تھے۔

شام کو وہ تھکا ہارا گھر آیا اور چارپائی پر بیٹھ کر حساب لگانے لگا۔ اس کی سزا تنخواہ والے روز ختم ہو گی۔ جب وہ ذرا موٹا سا بٹوہ جیب میں ڈالے گھر لوٹے گا تو قتو بھی اس سے چونّی مانگے گی، چتکبرا کتا بھی اس پر بھونکے گا۔ خود اسے ماں کی پھیلی ہوئی ہتھیلی بھی نظر آئے گی جو خود تو اچھی خاصی چٹّی ہو گی مگر جس کی لکیریں اندر سے سانولی ہوں گی۔ یہ سوچ کر اسرار پہلے تو مسکرا دیا کرتا تھا لیکن اس شام اس نے چاہا کہ مسکرائے مگر مسکرایا نہ گیا۔

کسی نوکر نے لا کر تپائی پر کھانا رکھا۔ سارے وہی پرانے تام چینی کے برتن تھے البتہ کھانے کے ساتھ پانی سے بھرا ہوا گلاس بھی تھا جسے کسی نے اچھی طرح دھویا تھا اور اس میں سوندھی مٹّی کی خوش بو بھی تھی۔

ایک رات تو اسرار حیرت سے اچھل پڑا۔ سونے کے لئے اس نے تکئے پر سر رکھا تو اسے یقین نہ آیا۔ تکئے کا غلاف دھلا ہوا تھا اور اس میں ہلکی ہلکی بھینی خوش بو آرہی تھی، بالکل برسات کے پہلے چھینٹے جیسی۔ وہ خوش ہوا اور اس نے چاہا کہ اسے ہنسی آجائے۔ وہ آ گئی۔

اب وہ مہینے کی تاریخیں گننے لگا۔ اب اسے پہلی تاریخ کا انتظار رہنے لگا۔ اب اسے احساس ہوا کہ دفتر کے کلرکوں کو پہلی تاریخ کا اتنی بے چینی سے انتظار کیوں رہتا ہے۔ وہ سب نظر آنا چاہتے ہیں۔

ایک روز حساب لگاتے لگاتے اس نے کہیں راہ میں چوہدری عبدالہادی کے بیٹے سے تاریخ پوچھ لی۔ اس وقت تو بیٹا دوسری طرف دیکھتا ہوا گزر گیا۔ شام کو جب اسرار کام سے گھر واپس آیا تو اسے اپنے سرہانے رکھا ہوا ایک پرچہ ملا۔ اس نے پڑھا۔ بالکل یوں لگا کہ لکھوایا ہے کسی ریٹائرڈ فوجی نے اور لکھا ہے زخموں کو چٹکی میں پکڑ کر ٹانکے لگانے والے کسی ڈاکٹر نے۔

اس میں لکھا تھا کہ آئندہ اگر تم نے بستی میں کسی سے بات کی تو تمہیں آختہ کر دیا جائے گا کہ اس قبیلے کی رسم یہی ہے۔

نہ وہ نکاح فسخ ہونے والی بات اس کی سمجھ میں آئی تھی نہ یہ آختہ جیسا لفظ اس کی سمجھ میں آیا۔ اس نے ذہن پر بہت زور ڈالا۔ شاید حواس آختہ ہو جاتے ہیں۔ یا شاید سبق دہرانے کو آختہ کہتے ہیں۔ پھر اسے خیال آیا کہ ذخیرے کو آختہ کہتے ہیں۔ مگر اس کا کیا مطلب ہوا۔ وہ کسی سے پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ذہن پر زور ڈالتے ڈالتے سو گیا۔

رات کو جب کبھی اس کی آنکھ کھلتی، ذہن میں یہ نیا لفظ بے کل ہوتا۔ ایک بار اس کی آنکھ کھلی تو اسے یوں لگا جیسے ابھی کوئی سرہانے کھڑا تھا۔ اس نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر بہت دیکھا لیکن کوئی نظر نہ آیا۔ پھر باہر برآمدے سے چوڑیاں کھنکنے کی اور کاغذ کا پرزہ پھاڑے جانے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

اسرار نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بہت دیکھا۔ ہوا میں سوندھی مٹی کی خوش بو تو سنگھائی دی لیکن نظر کچھ نہ آیا۔

جوں جوں دن گزرتے گئے، پہلی تاریخ دور سرکتی گئی۔ بستی والوں نے اسے نظروں سے اس طرح اوجھل کر دیا کہ ایک روز ایک سائیکل والا اس سے ٹکرایا تو یوں حیران ہوا جیسے کسی جھونکے سے ٹکرایا ہو۔

ڈاکیا اس کا خط لایا تو ہاتھ میں دینے کی بجائے دور سے یوں پھینکا جیسے خط اس کے قدموں میں نہیں، دریا میں پھینک رہا ہو۔

پھر ایک رات نڈھال ہو کر اس نے خود کو بستر پر یوں گرایا جیسے بستر پر نہیں، دریا میں گرا رہا ہو۔ وہ کراہنے لگا اور اپنے کراہنے پر خود حیران ہونے

لگا۔ یہ کیسا کراہنا تھا۔ وہ تو اچھا بھلا تندرست اور توانا تھا۔ مگر اس کراہنے میں ایک عجیب طرح کی راحت بھی تھی۔ وہ اس عجیب طرح کی راحت کو محسوس کرتے کرتے سو گیا۔ وہ سو تو گیا لیکن محسوس اسے یوں ہوا جیسے اس سے سویا نہیں جا رہا ہے۔

کسی نے آہستہ آہستہ دروازہ کھولا اور اسے صاف محسوس ہوا کہ دروازہ کھولنے والا اندر آ گیا ہے۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کیا کسی کے یوں دبے پاؤں آنے سے آختہ کیے جانے کا کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچنا چاہا لیکن اس سے سوچا نہ گیا۔ وہ یوں ہی بنا پڑا رہا جیسے سو رہا ہو۔

اندر آنے والے نے دروازہ آہستہ سے بند کیا اور اس نے آہٹ سے جان لیا کہ کوئی پنجوں پر چلتا ہوا اس کے قریب آ رہا ہے۔ جیسے جیسے وہ قریب آتا گیا، بارش کے پہلے چھینٹے کے ساتھ اٹھنے والی سوندھی خوش بو بھی قریب آتی گئی۔ اُسے کیا خبر تھی کہ خوش بو اس رات چوڑیاں اتار کر آئے گی۔

اگلی صبح اسرار دفتر نہیں گیا۔ میں بتاتا ہوں کہ اسرار کہاں گیا۔

نالے کی دوسری طرف، پہاڑیوں کے دامن میں قبائلیوں کا جوڈیرا ہے، وہ وہاں گیا۔ وہاں شادی بیاہ میں چلانے کے لئے اصلی بندوقیں کرائے پر ملتی تھیں۔ وہ بندوق کرائے پر لینے گیا تھا۔ اس نے سنا تھا کہ بندوق کرائے پر دینے والے کبھی پوچھتے نہیں کہ بندوق کا کیا کرو گے لیکن اس روز اس قبائلی نے اس سے پوچھا کہ بندوق کا کیا کرو گے؟

اس نے کہا، اور ہر لفظ کے معنی اچھی طرح سمجھتے ہوئے کہا۔

”چوہدری عبدالہادی کا آختہ۔“

خلیل خاں کی سوانح

یہ ایک سوانح ہے کہ نصف جس کا 'سوا' ہوتا ہے۔

اور یہ سوانح ہے ہمارے ایک دوست کی کہ ہر چند انہوں نے کسی زمانے میں فاختہ نہیں اُڑائی تھی مگر نام ان کا خلیل خاں تھا۔ یوں آنکھ ناک سے درست تھے البتہ شہادت کی انگلی ٹیڑھی تھی۔ اتنی ٹیڑھی کہ پاسپورٹ پر شناخت کے خانے میں انہوں نے اصرار کرکے لکھایا تھا کہ "انگشتِ شہادت خمیدہ ہے۔"

ایک بار کسی نے پوچھا کہ خلیل خاں، اپنی ایک انگلی ہمیشہ ٹیڑھی کیوں رکھتے ہو۔ کہنے لگے: کیا کریں، اس زمانے میں سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلتا۔

انگلی اتنی ٹیڑھی تھی کہ اگر کبھی محلے میں سب سے پہلے عید کا چاند دیکھ لیتے اور پھر محلے والوں کو انگلی کے اشارے سے چاند دکھانے کی کوشش کرتے تو محلے میں چاقو چل جاتے۔

خلیل خاں اپنی نوجوانی میں ایک کہاوت بہت کہا کرتے تھے اور وہ بھی پنجابی میں۔ ترجمہ اس کہاوت کا یوں تھا کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا یا جس نے عشق نہیں کیا، سمجھو کہ وہ پیدا ہی نہیں ہوا۔ خلیل خاں نے لاہور

کبھی نہیں دیکھا تھا لہٰذا پیدا ہونے کے اشتیاق میں وہ عشق کر بیٹھے۔ انہیں یہ بات کچھ عرصے بعد پتہ چلی کہ جسے وہ پیدا ہونے کا اشتیاق سمجھ بیٹھے تھے وہ اصل میں پیدا کرنے کا اشتیاق تھا۔

اس کا احوال ہم ذرا دیر بعد عرض کریں گے، پہلے خلیل خاں کے عشق پر تھوڑی سی روشنی ڈالتے چلیں۔

خلیل خاں اپنے رشتے داروں کی جس لڑکی پر عاشق ہوئے، اُسے دیکھ کر ہم نے ان سے پوچھا کہ اس کی کون سی ادا تمہیں اچھی لگی۔ تب پتہ چلا کہ وہ ایک روز کالج کے نوٹس دینے لڑکی کے کمرے میں چلے گئے تھے اور لڑکی نے اپنے تکیئے پر نہایت خوش خط حروف میں یہ عبارت کاڑھ رکھی تھی: آؤ سو جائیں۔

خلیل خاں نے بڑی مشکل سے خود کو روکا۔

اور پھر یہ ہوا کہ 'آؤ سو جائیں' کا الٹا اثر ہوا۔ اس دن کے بعد خلیل خاں کی نیندیں اڑ گئیں۔ ہم لوگ کہا کرتے تھے: خلیل خاں، اس شب بیداری کا کچھ علاج کرو۔ وہ کہتے: ہاں دیکھو کچھ کرتے ہیں۔

پھر ہم نے سنجیدگی سے مشورہ دینا شروع کیا کہ خلیل خاں شادی کرلو۔ وہ ہر بار یہی کہتے: ہاں دیکھو کچھ کرتے ہیں۔

اور پھر کرنا خدا کا یہ ہوا کہ اسی حمیدہ سے ان کی شادی ہوئی۔ چار پانچ سال گزر گئے تو ہم نے کہا: خلیل خاں، اب تو تمہارے ہاں بچہ ہونا چاہیے۔

کہنے لگے: ہاں دیکھو کچھ کرتے ہیں۔

یہ تو نہیں معلوم کہ انہوں نے کیا کیا لیکن چند ہفتے بعد ہی انہوں

نے یہ خوش خبری سنائی کہ خیر سے حمیدہ کا پیر بھاری ہے۔

خدا نے انہیں بیٹا دیا۔ چاند سا ہم اس لئے نہیں کہیں گے کہ ہو بہو باپ پر پڑا تھا۔ خوشی کے مارے خلیل خاں خود بھی بچہ بن گئے۔ بیٹے کے لئے ہمیشہ ایسا کھلونا لاتے جس سے خود ان کا دل بھی بہلے۔ ان ہی دنوں وہ ہانگ کانگ کی بنی ہوئی پلاسٹک کی ایک چھوٹی سے مرغی لائے جو اپنی دونوں ٹانگوں پر ہمہ وقت مستعد کھڑی رہتی تھی۔ جو نہی مرغی کو دباتے وہ جھٹ ایک انڈا دے دیتی۔ بار بار دبایئے، وہ ہر بار انڈا دیتی۔

یہ کھلونا آیا تو تھا بیٹے کے لئے لیکن ہوا یہ کہ خلیل خاں کی بیوی اس مرغی پر ایمان لے آئیں اور اس کی تقلید شروع کر دی۔ اب تو بچے پر بچہ پیدا ہونے لگا اور یوں لگتا تھا کہ معاملہ آورد سے نکل کر آمد کے مرحلے میں جا پہنچا ہے کہ شاعر لاکھ چاہے کہ شعر نہ ہو مگر شعر ہے کہ غیب سے آئے چلا جاتا ہے۔

ایک بار ہم نے کہا بھی کہ خلیل خاں بچے بند کرو۔ اس پر وہ صرف یہ کہہ کر رہ گئے کہ ہاں دیکھو کچھ کرتے ہیں۔ کئی بار ہم نے پوچھا بھی کہ کیا کر رہے ہو لیکن وہ تفصیل بتانے سے گریز کرتے رہے۔ ایک روز ہم کالج کے نوٹس دینے ان کے کمرے میں گئے تو دیکھا کہ دو تکیوں پر نہایت خوش خط حروف میں یہ عبارت کاڑھی گئی تھی:

"وقفہ بہت ضروری ہے۔"

لیکن تاگوں کے رنگ کچھ ایسے تھے کہ اندھیرے میں وہ عبارت مشکل ہی سے نظر آتی ہوگی۔

اتنے بچے ہوئے کہ خلیل کے وزن پر جلیل، جمیل، کفیل اور شکیل

جیسے ردیف ڈھونڈتے ڈھونڈتے خلیل خاں کا قافیہ تنگ ہو گیا۔ البتہ اس مشق کا نتیجہ وہی نکلا جو ایسی مشقوں کا نکلا کرتا ہے۔

خلیل خاں شاعر ہو گئے۔

یوں بھی ان دنوں شاعر بہت مزے میں تھے۔ مشاعرے تو رہے ایک طرف، امیر امرا اپنے بچوں کے عقیقے، ختنہ اور بسم اللہ کی تقریبوں میں بھی شاعروں کے طائفے بلانے لگے تھے۔ اس آؤ بھگت کو دیکھ کر خلیل خاں بھی کان پر رکھ کر قلم نکلے اور گلی کوچوں میں آوازیں لگانے لگے : غزل پڑھوالو۔

وہ مانے ہوئے اساتذہ کے کلام کو نمونہ بناکر ان ہی کے انداز میں شعر کہنے لگے۔ انہوں نے ولی دکنی سے لے کر سوہن راہی تک اور ماہ لقا بائی چندا سے لے کر سحاب قزلباش تک سارے ہی اساتذہ کی تقلید کر ڈالی۔ اس دوران بعض بڑے پائے کے شعر بھی کہے۔ مثلاً جن دنوں وہ ہمارے دوست ساقی فاروقی کا انداز اختیار کئے ہوئے تھے، انہوں نے ایک نہایت اعلیٰ نظم کہی جس کا عنوان تھا: کثرتِ اولاد۔ اور جس کا مطلع تھا

شادی کرکے خوش رہنا آسان نہیں

مجھ کو اپنے بچوں کی پہچان نہیں

وادیٔ شعر وادب کا شاید ہی کوئی پتھر ہو جو خلیل خاں نے پلٹے بغیر چھوڑ دیا ہو لیکن برا ہو اس دنیائے ادب کا جس نے ان کی قدر نہ کی۔ ویسے ان کی یہ دنیائے ادب ماہنامہ ادبی گزٹ کے ایڈیٹر حضرت ایم ایچ نقاد تک محدود تھی جو ان کے پڑوس میں رہتے تھے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، بڑے حضرت تھے۔ خلیل خاں ہر روز تازہ غزل کہتے اور حضرتِ نقاد کے پاس لے

جاتے۔ اور وہ حضرت ہر روز یہ کہہ کر ان کی غزل لوٹا دیتے کہ خلیل خاں، وہ دن گئے جب تم فاختہ اڑاتے تھے۔ روایت کو پاش پاش کرو۔ کلیشے توڑو۔ یہ جدیدیت کا دور ہے۔ یہ علامت کا زمانہ ہے۔ اگر سرریئلزم کی بات نہیں کرو گے تو ادب کے دودھ سے قدامت کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیئے جاؤ گے۔

یہ سن کر خلیل خاں اپنی غزل کو حسرت سے دیکھتے ہوئے لوٹ آتے اور جدید علامتی نثری نظم کہنے کے لئے رات رات بھر غور و فکر میں مصروف رہتے۔ وہ بار بار اپنی ٹیڑھی انگلی سے سر کھجاتے کہ شاید کچھ گھی نکل آئے۔ اس طرح ان کے یہ رت جگے مہینوں چلتے رہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ شعروں اور بچوں کی آمد بند ہو گئی۔

عین انہی دنوں حمیدہ کے والد بیمار پڑ گئے۔ بخار تیز ہوا تو انہیں اپنے چل چلاؤ کے آثار نظر آنے لگے۔ ایک روز بولے: خلیل بیٹے، سوچتا ہوں کہ مرنے سے پہلے کچھ وصیتیں لکھا دوں۔ کاغذ قلم تیار رکھو اور میرے سرہانے بیٹھے رہو۔ جب لکھاؤں تو حرف بہ حرف لکھتے جانا۔ اور دیکھنا کہ کہیں فرق نہ آنے پائے۔

ان بزرگوار کو تپ کی حالت میں غش پر غش آنے لگے اور بچارے خلیل خاں نہایت فرماں بردار داماد کی طرح شارٹ ہینڈ کی نوٹ بک سنبھالے ان کی پٹّی سے لگ کر بیٹھ گئے۔ بزرگوار کے بخار نے جو زور مارا تو وہ ہذیان بکنے لگے۔ خلیل خاں سمجھے یہی وصیت ہے۔ قبلہ جو کچھ کہتے گئے، برخوردار وہی لکھتے گئے، یہاں تک کہ کچھ اس قسم کی عبارت کاغذ پر منتقل ہو گئی:

زندگی ایک اینٹ ہے
اس کی خالا کا کسی لڑھکے سے رشتہ طے کر دو
یہ اناروں کے شگوفے
ہکلے کتوں نے چبائے
اور اندھے گھوسیوں کا دودھ
فولادی چنے بن کر
سور کی تھوتھنی میں گھُس گیا
اس کو اچھو ہو گیا
نیلے بگلے
اودے کوّوں سے لڑے
اور لڑتے لڑتے ہنس پڑے
کہنے لگے
کوڑیوں کے مول لگادی ہیں
گلاب ہو رہی ہیں گنڈیریاں

خلیل خاں نے یہ عبارت لکھ کر نوٹ بک ایک طرف رکھی اور گردن ڈھلکا کر یوں اوندھ گئے کہ اگرچہ انتقال ہوا سسر کا لیکن نظریوں آتا تھا جیسے روح داماد کے بدن سے کھینچی گئی ہو۔

صبح اٹھ کر بچوں نے دیکھا کہ باپ نے مہینوں بعد کچھ لکھا ہے۔ وہ سمجھے تازہ غزل ہوئی ہے۔ نوٹ بک سے کاغذ پھاڑا اور ادبی گزٹ کے دفتر میں جا کر حضرت ایم ایچ نقاد کو دے آئے۔

ایک گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ حضرت نقاد لپکتے ہوئے خلیل خاں کے گھر میں گھس آئے اور انہیں سینے سے لگا کر زور زور سے بھینچنے لگے۔ ان کی بانہوں میں دبے ہوئے خلیل خاں نے گھُٹی گھُٹی سی آواز میں کہا کہ میرے سسر کا انتقال ہو گیا ہے۔ ایم ایچ نقاد بولے: خاک ڈالو سسرے پر۔

خلیل خاں نے کہا: پہلے غسل تو ہو جانے دو۔

مگر ادبی گزٹ کے ایڈیٹر نے ان کی ایک نہ سنی اور اپنی مخصوص گرج دار آواز میں بولے: خلیل۔ تم نے ایسی تجریدی نظم کہہ دی ہے کہ یہ سرریئلزم کی دنیا میں اردو زبان کی آبرو ٹھہرے گی۔

خلیل خاں کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ یہ کس نظم کی بات ہو رہی ہے لیکن چند روز بعد جب ادبی گزٹ کا تازہ شمارہ آیا تو خلیل خاں نے مرحوم و مغفور کے آخری کلمات نظم کی صورت میں چھپے دیکھے اور وہ بھی اس شان سے کہ ایڈیٹر نے نظم کو عنوان دیا: پھڑکتی رگ۔

بس اب کیا تھا۔ خلیل خاں کی سرریئلزم کی رگ پھڑکی اور علامتی، تجریدی اور نثری نظمیں یوں کہنے لگے گویا شاعر نہ ہوں، ہر بار دبائے جانے پر جدیدیت کا انڈا دینے والی ہانگ کانگ کی بنی پلاسٹک کی مرغی ہوں۔

ایک نظم کا اقتباس۔ عنوان ہے: قلوپطرہ کا کاجل

چاندنی ٹن ٹن بج رہی تھی

بچے سمجھے کہ چھٹی ہو گئی

وہ پلاسٹک کے موزے پہن کر

بھڑبھونجے کے بھاڑ میں اُتر گئے۔

ایک اَور نظم:

میں آدمی نہیں ہوں

باگڑ بلا ہوں

میری چونچ میں دبا ہوا قطب مینار

میری محبوبہ کی ایڑی کا کانٹا ہے

وہ ریل کے پھاٹک پر کھڑی

گنّے چوس رہی ہے۔

[نظم کا عنوان ہے: مگدھ میں قوالی]

گھوڑے نے پتلون پہن لیا ہے

مگر وہ گھوڑا نہیں

میگھ ملہار گانے والی نیل گائے ہے

رات کی باریک سوئیاں

اوکاڑے کے گھی میں تلے ہوئے

پرانے جوتوں کی کھٹ کھٹ سن کر

ڈسکو کرنے لگی ہیں

میرے خدا

میرے انگوٹھے کو عقل دے۔

[نظم کا عنوان: سہاگن کی مناجات]

خلیل خاں نے جو ایسی نظمیں لکھیں تو اصولاً ادب اور تنقید کی دنیا میں طوفان آجانا چاہئے تھا۔ انہیں محسوس ہوا کہ طوفان آیا ہی چاہتا ہے مگر کوئی چیز اسے روکے ہوئے ہے۔ آخر انہوں نے وہی کیا جو ایسے موقعوں

پر ایسے شاعر کو کرنا چاہئے۔ انہوں نے تنقید کا گھی اپنی ٹیڑھی انگلی سے نکالنے کا فیصلہ کیا۔

شہر کے مشہور نقاد محمد فاضل چکوالی نے اپنے بچے کو بھیجا کہ خلیل خاں کے گھر سے ذرا دیر کے لئے ایک چھری لے آئے۔ خلیل خاں نے چھری کے ساتھ ایک خربوزہ بھی بھیج دیا۔

ایک اور نقاد اکرام الٰہی رستم خانی کی بکری نے بچہ دیا۔ خلیل خاں نے ڈسپوزیبل پوتڑوں کا پیکٹ بھجوادیا۔

مشہور انشا پرداز اور محقق احسان اللہ چاند مار کی بیوی نے ان کے گھر سے پیاز کی گٹھّی منگائی تو انہوں نے آنسو پونچھنے کے لئے رومال بھی بھیج دیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ادب اور تنقید کی دنیا میں نہ صرف طوفان بلکہ بھونچال بھی آیا اور اس کے ساتھ جو سمندری لہریں اٹھیں وہ روایت کی دراڑوں میں دبک کر بیٹھے ہوئے پھونس جیسے مردہ پرست شاعروں کو سوکھے تنکوں کی طرح بہا کر لے گئیں۔

خلیل خاں کی شاعری پر تنقید نگاروں نے جو کچھ لکھا اس کے کچھ اقتباس پیشِ خدمت ہیں:

محمد فاضل چکوالی نے لکھا: خربوزہ چھری پر گرے یا چھری خربوزے پر، ایک ہی بات ہے۔ اسی عمل کی تاثیر ہے کہ خلیل خاں کا وژن ان کی بصیرت کا ڈائلما بن گیا ہے۔ ان کی شعوری اور لاشعوری حسیات بودلیئر اور ریمبو کے سرریئلی اسالیب سے بھی ماورا ہیں۔

اکرام الٰہی رستم خانی نے لکھا: اگرچہ خلیل خاں پوتڑوں کے رئیس

ہیں لیکن ان کی نظم 'کدو کا بیج' میں ان کی حسیاتی لہر ہمیں اُس فکری نہج پر لے جاتی ہے جہاں تخلیقی ابہام تخلیقی تحرک بن کر اسپین کے شاعر لورکا کی نظموں کو پیچھے چھوڑ جاتا ہے۔

اور احسان اللہ چاند مار نے خلیل خاں کے کلام پر جو کچھ لکھا اس میں نمک مرچ ہی نہیں بلکہ پیاز کا بگھار بھی لگایا۔ انہوں نے لکھا: خلیل خاں کا وژن کلیشے سے بے نیاز ہے جو اپنے فوق حقیقی معمورے میں مارٹن ہائیڈیگر کے ہمہ گیر ابدیت کے تصور کے دھارے ٹی ایس ایلیٹ کی لاشعوری حسیّات سے ملاتا ہے اور اس تناظر میں رلکے اور ملارمے کی شاعری کتنی ہی کثیر الجہت سہی، خلیل خاں کے عصری ارتسامات کا ان میں شائبہ تک نہیں۔

اتفاق سے ان ہی دنوں احسان اللہ چاند مار سے ہماری ملاقات ہو گئی اور ہم نے ان سے پوچھا کہ یہ عصری ارتسامات کسے کہتے ہیں؟

ہمارا سوال سن کر انہوں نے اپنی بائیں کلائی گھما کر کہنی کو بل دیا اور انگلیوں کو مروڑ کر ہتھیلی کو پیالہ بنایا اور بازو کو الٹا گھما کر اسے بغل کے ساتھ بھینچا اور چھنگلیا کا ناخن دل اور دماغ کی لکیروں میں گڑوتے ہوئے بولے: یہ دیکھ رہے ہو؟ اسے کہتے ہیں عصری ارتسامات۔

غرض یہ کہ ہر طرف خلیل خاں کی جدید نثری نظم کا ڈنکا بجنے لگا اور پھر یہ ہوا کہ ایک بین الاقوامی مشاعرے میں ان کا بلاوا آ گیا۔ وہ بھی ادب کی تاریخ میں لکھا جانے والا لمحہ تھا۔ جب سارے شاعر بھگت گئے تو خلیل خاں کے نام کا اعلان یوں ہوا:

'خواتین و حضرات، خلیل خاں اپنی تازہ علامتی نظم سنا رہے ہیں

جس کا عنوان ہے، 'میں خاموش ہوں'

اس کے بعد خلیل خاں اسٹیج پر آئے۔ تین منٹ تک سر جھکائے خاموش کھڑے رہے اور پھر چلے گئے۔ ہزاروں کے مجمع سے کھچا کھچ بھرا ہوا پورا ہال بے حال ہو گیا۔

پھر دوسرا مشاعرہ ہوا مگر وہ خلیل خاں کی زندگی کی آخری مشاعرہ ثابت ہوا۔ اِس بار اُن کی نظم کا عنوان تھا: 'میں برہنہ ہوں۔'

ٹین کا خالی ڈبّا

خدا خدا کر کے اسکول کی عمارت کا مسئلہ حل ہوا اور اُس نے میرے خواب میں آنا چھوڑا۔ مگر ٹین کے ڈبّے کا مسئلہ کسی حال حل ہونے کو نہیں آتا۔ وہ بدستور خواب میں آئے چلا جاتا ہے۔ اسکول کا تو یہ تھا کہ اس کے درودیوار نظر آتے تھے۔ ٹین کا ڈبّا نظر نہیں آتا، خواب میں اس کی صرف آواز آتی ہے۔

اسکول میرے لڑکپن کا اسکول تھا۔ کیسی اچھی سرخ اینٹوں اور سرخ کھپریلوں کی عمارت تھی۔ کیسے اچھے سرخ اینٹوں کے فرش اور گلاب اور گیندے کی کیاریاں تھیں۔ کیسے اچھے کلاس روم، کتنا عمدہ بڑا سا ہال اور کیسا گھنا وہ درخت تھا جس کے نیچے ہر صبح سارے لڑکے قطاریں بنا کر کھڑے ہوتے تھے اور 'لب پہ آتی ہے دعا' گایا کرتے تھے۔ کسی کے سُر اِدھر جاتے تھے اور کسی کی تانیں اُدھر، لیکن اچھا لگتا تھا۔

اس کے بعد چوتھی جماعت کے ٹیچر مسٹر سائمن صبح کے اخبار کی خاص خاص خبریں پڑھ کر سناتے تھے۔ انہوں ہی نے جاپان کے کسی جزیرے پر ایک ایسے بم کے گرنے کی خبر سنائی تھی جو صرف ایک ذرّے سے بنا تھا لیکن جس نے پورا جزیرہ تباہ کر دیا تھا اور ساری آبادی کو مار ڈالا تھا۔

وہ ہیڈ ماسٹر کے کمرے کی چھت کے اوپر لگا ہوا گھنٹہ جو سنا ہے کہ انجینئرنگ کالج کے لڑکوں نے ڈھالا تھا۔ وہ بڑا سا کھیلوں کا میدان جس میں سنا ہے کہ ایک بار کوئی ہوائی جہاز اتر آیا تھا۔ دوسری جانب ہاسٹل کی عمارت اور چار دیواری کے پچھواڑے وہ کچی سڑک جس پر دھول اڑاتی ہوئی بیل گاڑیاں گنّے لادے گزرا کرتی تھیں۔

وہ سب میرے وجود سے چمٹا چمٹا چلا آیا اور اسکول نے ہر رات خواب میں آنا شروع کر دیا۔ کبھی یوں نظر آتا کہ عمارت میں توسیع ہو رہی ہے۔ کبھی یہ دکھائی دیتا کہ ایک بالائی منزل بھی بن گئی ہے۔ بس جب بھی نظر آئی، ترقی ہی نظر آئی۔

پورے ۳۵ سال بعد جب میں واپس گیا اور اسکول کے زمانے کے دوستوں سے ملا تو کوئی گنجا ہو چکا تھا، کسی کی کمر جھک گئی تھی، کسی کے بال سفید ہو گئے تھے اور چشمہ تو ہر ایک نے لگا رکھا تھا۔ جب اچھی طرح گلے مل چکے اور دوستوں کی بیویوں نے پوچھا کہ کیا کھایئے گا، اُس وقت میرے جواب نے انہیں حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے کہا کہ خدا کے لئے پہلے چل کر مجھے اسکول دکھا دو۔ ایک بار دیکھ لوں تو شاید وہ خوابوں میں آنا چھوڑ دے۔

جہاں ہم سب صبح صبح پیدل جایا کرتے تھے اور سہ پہر کو پیدل لوٹا کرتے تھے، اس روز سب کاروں میں بھر کر وہاں گئے۔ کاروں میں ہم سب اور آگے پیچھے، دائیں بائیں اسکوٹروں پر دوستوں کے جوان بیٹے۔

جا کر اسکول دیکھا۔ کاش نہ دیکھا ہوتا۔ وہ ٹوٹ چکا تھا، پھوٹ چکا تھا۔ نہ توسیع ہوئی تھی، نہ دوسری منزل بنی تھی، بلکہ ہال اور سائنس روم کی چھتیں گر چکی تھیں۔ جو نہیں گری تھیں، حیران ہوں کہ انہیں کیا ہوا ؟

ہاں مجھے یہ ہوا کہ وہ دن اور آج کا دن، پھر کبھی اسکول خواب میں نہیں آیا۔ شاید ہم دونوں نے ایک دوسرے کا پیچھا چھوڑ دیا۔ اس طرف سے اطمینان ہوا اور میں چین سے سونے لگا۔ مگر اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اُس ٹین کے ڈبے کا کیا کروں۔

جاڑوں کی رات تھی اور جاڑے بھی لندن کے۔ ایک تو پت جھڑ اوپر سے رات کی تیز ہوائیں۔ سڑک کی پیلی پیلی روشنیاں دھندلائی ہوئی سی تھیں اور باہر سنّاٹا پڑا تھا۔ ہوا کا شور تو کم تھا البتہ سوکھے پتّے اُڑنے کی آواز یوں آ رہی تھی جیسے کوئی مجمع اپنی مرضی کے خلاف تالیاں بجا رہا ہو۔ نہ کسی کے قدموں کی آواز تھی، نہ کتّے بھونک رہے تھے اور وہ جو رات کے دوران اِکّادُکّا کاریں گزر جاتی ہیں، اس رات وہ بھی نہیں گزر رہی تھیں۔

اتنے میں کہیں سے ایک آواز آئی۔ گلی کے ایک سرے سے ٹین کے ایک خالی ڈبّے نے لڑھکنا شروع کیا۔ ہوا تیز ہوتی تو وہ بھی تیزی سے لڑھکتا۔ ہوا سست پڑ جاتی تو وہ بھی ذرا سا سرک کر رہ جاتا۔

اس کی آواز سے یہی گمان ہوتا تھا کہ خالی ہے لیکن شاید اس کے اندر تھوڑا سا پانی وانی بھرا ہوا تھا کیونکہ اس کی آواز ذرا ذرا سی بوجھل تھی۔ کبھی ٹین کا ڈبّا لڑھکنے کو آواز آتی، کبھی کبھی صرف پتّے اڑنے کا شور ہوتا۔ پھر ذرا دیر کے لئے ان دونوں کی آوازیں اکٹھی آتیں۔

ایک بار آواز سے یوں لگا کہ ڈبّا لڑھکتے لڑھکتے سوکھے پتوں کی کسی ڈھیری میں پھنس گیا ہے۔ اک ذرا ذرا سی آنے والی آواز سے صاف لگتا تھا کہ وہ ڈھیری سے نکلنے کے جتن کر رہا ہے۔ پھر ایک تیز جھونکا آیا۔ بہت سے پتّے اُڑے اور مجھے محسوس ہوا کہ ڈبّے کو رہائی مل گئی ہے۔ اب وہ تیزی سے لڑھکتا

ہوا میرے گھر کے سامنے آ پہنچا۔ بہت جی چاہا کہ اٹھ کر اور کھڑکی کا پردہ سرکا کر اسے دیکھوں مگر پھر یہ سوچ کر اپنے اوپر ہنسی آئی کہ ایک اچھا بھلا شخص ٹین کا خالی ڈبّا دیکھنے کے لئے گرم گرم بستر سے نکلا ہے۔

شاید ہوا کا رخ بدلا، یا خدا جانے کیا ہوا، ڈبّا وہیں رک گیا۔ ہو سکتا ہے وہ جو بلّیاں گھروں کی دہلیزوں کے باہر رکھی ہوئی دودھ کی خالی بوتلوں کی گردنوں پر جما ہوا باسی دودھ رات بھر چاٹتی پھرتی ہیں، وہ ڈبے کو چاٹ رہی ہوں۔ مگر کوکا کولا سے بلیوں کی کیا دلچسپی۔ ممکن ہے بیئر کا ڈبّا ہو، مگر کیا بلیاں بیئر پی لیتی ہیں؟ مشکل ہی ہے۔ لیکن برطانیہ کی بلیوں کا کیا اعتبار۔

ایک بار ہم نے قورمے کی بچی ہوئی بوٹیاں باہر ڈال دی تھیں، بلّیاں حقارت سے سونگھ کر آگے بڑھ گئیں۔ پھر ایک روز جب اسکاٹ لینڈ کی گائے کے گوشت کا بچا ہوا اسٹیک باہر ڈالا تو بلیوں نے تمام رات دھینگا مشتی مچائے رکھی۔

میری سوچوں سے بے نیاز ٹین کے خالی ڈبے نے ایک جست سی بھری اور ہوا کے سرد جھونکوں کے ساتھ لڑھکتا لڑھکتا آگے نکل گیا۔ کبھی سوکھے پتے آگے ہوتے، کبھی وہ خود۔ میں سوچنے لگا کہ گلی کے دوسرے کنارے پر پہنچ کر وہ کیا کرے گا۔ بائیں جانب مڑے گا یا بڑی سڑک پار کر کے دوسری طرف اتر جائے گا۔

اب اس کے جانے کی آواز مدھم پڑتی جا رہی تھی مگر پتوں کے شور کے باوجود صاف تھی۔ اتنے میں باہر گلی میں تیز روشنی ہوئی۔ جدھر سے ڈبّا آ رہا تھا، اُدھر سے ایک کار آئی۔ سوکھے پتوں کو کچلتی ہوئی وہ میرے گھر کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھ گئی۔ پھر یوں لگا کہ گلی کے دوسرے کنارے پر

وہ ایک لمحے کو رکی اور کہیں چلی گئی۔

مگر اس کے بعد ایک عجیب بات ہوئی۔ ٹین کے خالی ڈبے کے لڑھکنے کی آواز آنی بند ہو گئی۔ جھونکے بھی آئے، پتّے بھی اڑے لیکن ڈبے نے جیسے چپ سادھ لی۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے۔ جب سب کچھ چل رہا ہے تو ڈبے کا لڑھکنا کیسے رک سکتا ہے۔

میں نے لحاف الٹا، بستر سے باہر نکلا اور کھڑکی کا پردہ اٹھا کر اس طرف دیکھا جدھر ڈبّا گیا تھا، لیکن مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ ہر طرف پتّے ہی پتّے اُڑ رہے تھے۔ خیال تھا کہ ان کی آڑ سے ڈبّا جھانکے گا۔ مگر اسے کیا پڑی تھی جو وہ جھانکتا۔

کیا ہوا؟ میں سوچنے لگا۔ کہیں وہ کار اسے کچلتی ہوئی تو نہیں گزر گئی۔ میں اَور سوچنے لگا۔

میرا سوچنا نہ تھا۔ رات کا ڈھلنا بھی نہ تھا۔ ذرا سی روشنی ہونی تھی کہ میں نے لپک کر گاؤن پہنا، سلیپریں پہنیں، دروازہ کھولا اور باہر نکل کر وہاں جا پہنچا جہاں میرا خیال تھا کہ کار نے ڈبّے کو کچلا ہو گا۔ لیکن وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

کچھ سوکھے پتّے تھے، انہیں میں پیر سے ہٹانے لگا۔ پھر بھی کچھ نہ نکلا تو میں نے پہلے ایک ہاتھ سے، پھر دونوں ہاتھوں سے پتّے ہٹانے شروع کیے۔ نیچے سے اجلی سڑک نکل آئی لیکن ٹین کا ڈبّا نہ نکلا۔ میں سڑک کے ساتھ ساتھ دور تک گیا، موڑ تک پہنچا۔ اِدھر اُدھر دیکھا مگر ڈبا کہیں نہ ملا۔

واپس آکر میں نے چائے بنائی، ایک دن پرانا اخبار پڑھا اور دیر تک پچھلی کھڑکی سے باغ کو دیکھتا رہا۔ ڈبے کے یوں غائب ہو جانے کی گتھی سلجھنے

کے بجائے الجھتی جارہی تھی۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ جو کار گزری تھی اور گلی کے سرے پر رکی تھی اس میں وہ آدمی بیٹھا ہو جو کم سن بچوں کو اٹھالے جاتا ہے، ان پر مجرمانہ حملہ کرتا ہے اور پھر انہیں مار کر لاش کہیں پھینک دیتا ہے۔

ذہن نے اتنا سوچا کہ بالآخر سوچنا چھوڑ دیا۔ نیا اخبار آگیا اور دن کے معمولات شروع ہوگئے۔

یہاں تک تو غنیمت تھا۔

اس کے بعد سے اب یہ حالت ہے کہ اکثر رات کو ایک خواب کہیں سے آجاتا ہے۔ اس خواب میں کچھ نظر نہیں آتا، صرف آوازیں آتی ہیں، ہوا کی آوازیں، سوکھے پتے اڑنے کی آوازیں اور ایک ڈبے کے لڑھکنے کی آوازیں۔ ٹین کے خالی ڈبے کی۔

اب سوچتا ہوں کہ کوئی مجھے وہ ڈبا دکھادے۔

کھلا ہوا سہی۔

رام کی لیلا

سلطان نوجوان تھا۔ خوب رونوجوان، چوڑا چکلا، توانا اور تنومند۔ بستی میں نکلتا تو مائیں اس کی ماں پر رشک کرتیں۔ وہ بھی ایک ایک سے گھل مل کر باتیں کرتا۔ دنیا زمانے کی باتیں، دنیا جہان کے قصے۔ لیکن یہ ساری باتیں اس کی بے خوابی کی بات پر آکر ختم ہوتیں۔

جوں ہی وہ اپنے نیند نہ آنے کا قصہ چھیڑتا، لوگ موضوع بدلنے کی کوشش شروع کردیتے یا پھر چاہتے کہ وہ اپنی بات مختصر کرے اور آگے بڑھ جائے۔

'حافظ جی، مجھے رات بھر نیند نہیں آتی۔ قاضی جی، میری نیند اڑ گئی ہے۔ میر صاحب، میں سو نہیں سکتا۔ حکیم صاحب، رات بھر جاگتا ہوں۔' جہاں وہ باتیں کرتا، اس طرح کی بات ضرور چھیڑ دیتا۔

مختار صاحب نے کہا کہ جوان ہو۔ اس عمر میں تو خوب نیند آتی ہے۔

ممتاز صاحب بولے۔ "میاں جب ہم تمہاری عمر کے تھے تو گھوڑے بیچ کر سوتے تھے۔"

وہ بولا۔ "مگر ممتاز صاحب، گھوڑے سے تو ہماری روزی ہے۔"

سلطان کا باپ تانگہ چلاتا تھا۔ جیسا سجا دھجا اس کا تانگہ تھا، ویسی ہی شاندار اس کی گھوڑی تھی۔ لوگ کہا کرتے تھے کہ بیٹے سے تانگہ چلوایا کرو، وہ بھی بڑا شان دار ہے۔ مگر باپ کہتا کہ بیٹا پڑھ لکھ کر بابو بن جائے گا تو میز کرسی پر زیادہ سجے گا۔

سلطان ایک صبح مختار ٹھیکے دار کے پاس بیٹھا تھا اور دونوں بحث مباحثے میں الجھے ہوئے تھے۔ مختار نے کہا کہ یہ تمہارا وہم ہے، تمہیں نیند ضرور آتی ہوگی۔ تمہیں صرف یوں محسوس ہوتا ہے کہ تم رات بھر جاگتے رہے۔

اس پر سلطان نے اپنے جاگنے کا ثبوت پیش کر دیا۔ کہنے لگا کہ پچھلی کئی راتوں سے آپ کے گھر میں کسی کی طبیعت خراب ہے، کسی کو بار بار الٹی ہوتی ہے۔ پھر بولا۔ "اور بتاؤں؟"

مختار ٹھیکے دار کی تو گویا جان ہی نکل گئی۔ انہوں نے جلدی سے موضوع بدلا اور ڈرے کہ کہیں وہ ان کی بیوی کے حاملہ ہونے کا شروع سے سارا ماجرا بیان نہ کر دے۔

کس کے گھر رات کو چور گھسے، کہاں بلّیاں لڑیں، کب پرانے پیپل پر الّو آ بیٹھا اور لوگوں نے پتھر مار مار کر اسے کیسے اڑایا، کس کے گھر میں بچہ رویا، کہاں رات کو ٹیلی گرام آیا اور اس میں کیا لکھا تھا، کون دن نکلنے سے پہلے تانگے پر بیٹھ کر اسٹیشن گیا اور کس نے گھنٹوں ڈاکٹر کا دروازہ پیٹا لیکن ڈاکٹر پھر بھی نہ جاگا۔ سلطان کو ساری راتوں کے احوال معلوم تھے۔

پہاڑی بازار والے حکیم صاحب کہیں یہ کہہ بیٹھے کہ دن بھر جسمانی مشقّت کیا کرو، رات کو نیند ضرور آئے گی۔ اس پر سلطان خفا ہو گیا اور

کہنے لگا کہ میری طرح کوئی روز صبح تانگہ دھو کر، گھوڑی کا چارا بنا کر، اُس کی گھنٹے بھر مالش کر کے اور ٹال پر جا کر لکڑی چیر کر دکھادے، پھر اسے پتہ چلے کہ مشقّت کسے کہتے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ جب سلطان تانگے کو دھو کر اُسے چمکاتا تھا، چارے کی بوریاں ڈھوتا تھا اور گھوڑی کی مالش کر کے اسے تھپکیاں دیتا تھا تو چلتے ہوئے لوگ اس کے توانا بدن کو دیکھنے کے لئے رک جایا کرتے تھے۔

ہفتے میں ایک دن وہ ٹال پر جا کر لکڑیاں چیرتا تھا۔ ذرا سی دیر میں وہ چِری ہوئی لکڑیوں کا انبار لگا دیتا تھا مگر لوگ اُس انبار کو نہیں بلکہ سلطان کی مضبوط کلائیوں، بانہوں اور پنڈلیوں کو دیکھا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ نیند اڑے نہ اڑے بستی کی لڑکیوں کی اُڑے، اس جوان کی نیند کیسے اُڑ سکتی ہے۔

لیکن شہر میں اس کی نیند کا مباحثہ جاری رہتا۔ ایک روز ڈاکٹر جمنا پرشاد نے اسے کچھ گولیاں دیں اور کہا کہ رات لیٹنے سے پہلے صرف ایک گولی کھالینا اور صبح آکر مجھے بتانا کہ کیا ہوا۔

سلطان اگلی صبح ڈاکٹر صاحب کے پاس پہنچا اور بولا کہ رات بھر آپ کے گھر کے ٹیلی فون کی گھنٹی کیوں بجتی رہی؟ ڈاکٹر صاحب نے جی کڑا کر کے بتا ہی دیا کہ دہرہ دون میں ان کی جوان بیٹی نے بہت سی خواب آور گولیاں نگل لی تھیں، وہاں سے فون آرہے تھے۔

کوئی اَور ہوتا تو ڈاکٹر صاحب اسے کچھ اَور بتاتے۔

کوتوالی والے، مجرموں کو رات کے وقت جگا کر مارا پیٹا کرتے تھے لیکن جب سلطان نے بستی والوں کو پوچھ گچھ کی ذرا ذرا سی تفصیل بتانا شروع

کی تو داروغہ نے اس بلا کر دھمکی دی کہ اگر اس نے رات کا جاگنا ترک نہ کیا تو پولیس والے سلانے کے دوسرے طریقے بھی جانتے ہیں۔ جب اس طرح کی دھمکیوں کا بھی اثر نہ ہوا تو کوتوالی والے اپنے مجرموں کو تفتیش کے لئے مظفر نگر اور سہارن پور بھیجنے لگے۔

ایک بار عجب قصہ ہوا۔ رات کے وقت کسی شخص نے شرفا کے گھروں میں اتر کر بہو بیٹیوں کو تنگ کرنا شروع کیا۔ سارے مکان ملے ہوئے تھے۔ وہ اندھیرے میں چھتوں چھتوں چلتا ہوا دالانوں میں اترتا اور سوئی ہوئی خواتین پر دست درازی کرتا۔ بستی میں ایسا تو پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ اور پھر یہ کہ ہر شخص ہر شخص کو جانتا تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس کو شک کی نگاہ سے دیکھے اور کس کو شبہ کی نظر سے۔ ڈری سہمی خواتین حلیہ بیان کرتی تھیں تو اس سے بھی کچھ حال نہ کھلتا تھا۔

کسی کو خیال آیا کہ چل کر سلطان سے پوچھا جائے۔ اس پر بہت سے لوگ اٹھے اور سولانی ندی پر پہنچے جہاں سلطان گھوڑی کو نہلانے لے گیا تھا۔ اس سے پوچھا گیا تو اس نے کہا کہ اسے ہر اس گھر اور ہر اس حویلی کی خبر ہے جہاں رات کو وہ شخص اترا تھا۔

لوگوں نے پوچھا۔ "مگر وہ ہے کون؟"

سلطان نے کہا۔ "یہ تو نہیں بتا سکتا لیکن یہ وعدہ کر سکتا ہوں کہ آج کے بعد وہ شخص کبھی نظر نہیں آئے گا۔۔۔ میرا مطلب ہے رات کے وقت۔"

لوگ مطمئن نہیں ہوئے اور چلے گئے۔ سلطان نے گھوڑی کو لاکر باندھا اور چہرے پر بہنے والا گرمیوں کی صبح کا پسینہ پونچھتا ہوا علاقے میں

سگریٹ کے سب سے بڑے تاجر حافظ عبدالشکور کے پاس پہنچا اور بولا۔
"حافظ جی۔۔۔۔۔" اس کے بعد ان کے کان میں کچھ کہا اور واپس چلا آیا۔

وہ دن اور آج کا دن، پھر کسی رات کسی کے گھر میں کسی اجنبی نے قدم بھی نہیں رکھا۔

شہر میں ایک کہاوت چل گئی۔ "سلطان سے رات کا حال چھپا نہیں رہ سکتا۔"

نو بیاہے جوڑے بستی میں رکنے کی بجائے لمبے لمبے ہنی مون پر مسوری اور نینی تال جانے لگے۔

سلطان کی شب بیداری کی طرح اس کے باپ کے تانگے کے پھیرے چلتے رہے۔ لوگ اس کے سجے دھجے تانگے میں شوق سے بیٹھتے اور اچھا کرایہ دیتے۔ عورتیں کہیں جاتیں تو اصرار کر کے اس کا تانگہ منگواتیں کیونکہ اس کا باپ شریف تھا اور اس کے تانگے میں نر نہیں، مادہ جُتی تھی۔

جامع مسجد کے سامنے رہنے والے چوہدری صاحب کی بیٹی روز صبح اسی کے تانگے پر اسکول جاتی تھی اور سہ پہر کو اسی پر لوٹ کر آتی تھی۔ سلطان کا باپ مقررہ وقت پر بلاناغہ ان کے گھر پہنچتا، تانگے کے گرد چادر لپیٹتا، بِٹیا کو آواز دیتا اور اسی طرح ہر سہ پہر لڑکی کو واپس پہنچا دیتا۔ چوہدری صاحب اس بندوبست سے بہت خوش تھے۔

ایک صبح وہ معمول کے مطابق لڑکی کو اسکول لے جا رہا تھا کہ زور کی بارش ہوئی اور اولے گرے۔ اگرچہ اُس نے موٹی سی چادر لپیٹی اور سر اچھی طرح ڈھانپ لیا لیکن چونکہ تانگے میں لڑکی بیٹھی تھی اور وہ پائیدان چھوڑ کر تانگے کی اگلی نشست پر چھت کے نیچے نہیں بیٹھ سکتا تھا اس لئے

خوب اچھی طرح بھیگا اور بری طرح چھینکتا ہوا گھر پہنچا۔

دوپہر تک اسے زور کا بخار چڑھا اور ڈاکٹر جمنا پرشاد نے ہدایت کر دی کہ وہ ایک ہفتے مکمل آرام کرے، ساتھ ہی چوہدری صاحب کے گھر خبر کرا دی گئی کہ بٹیا کو اسکول سے لانے کے لئے سلطان تانگہ لے جائے گا۔

سلطان گھنٹی بجنے سے کافی پہلے اسکول پہنچ گیا۔ تانگے کے گرد چادر بہت سلیقے سے باندھی اور گھوڑی کی گردن تھپک تھپک کر بٹیا کا انتظار کرنے لگا۔

چھٹی ہوتے ہی اسکول کے بڑے گیٹ سے لڑکیوں کا سیلاب سا امڈا اور سلطان نے ایک برقع پوش لڑکی کو اپنے تانگے کی طرف آتے دیکھا۔ اس نے گھوڑی کی لگام کس کے پکڑ لی تاکہ تانگہ اپنی جگہ رکا رہے۔ لڑکی نئے کوچوان کو دیکھ کر ذرا سی ٹھٹکی لیکن تانگے کا چوکھٹا پکڑ کر پچھلی نشست پر بیٹھنے لگی تو سلطان نے اس کا ہاتھ دیکھا۔ کھلی رنگت کی انگلیوں نے چوکھٹا مضبوطی سے پکڑا تو ناخن سرخ ہو گئے۔ لڑکی نے ناخن بڑھا رکھے تھے اور انہیں بڑی خوبی سے تراشا بھی تھا۔

سلطان کو جب یقین ہو گیا کہ سواری اچھی طرح بیٹھ گئی ہے تو وہ تانگے کی اگلی نشست پر بیٹھا اور گھوڑی کو ہانک دیا۔ سلطان کو معلوم نہیں تھا کہ پچھلی نشست پر پردہ دار بہو بیٹیاں بیٹھی ہوں تو کوچوان کو اگلے پائیدان پر بیٹھنا چاہیئے، اگلی نشست پر نہیں۔

تانگے کے گرد بندھی ہوئی چادر اس کی پیٹھ کو چھو رہی تھی اور بارش کے دن والی ٹھنڈی ہوا اس کے ماتھے پر پڑے ہوئے بالوں سے الجھ رہی تھی۔ گھوڑی شاید اپنے کوچوان سے خوش تھی، اس نے اٹھلا اٹھلا کر چلنا

شروع کیا، یہاں تک کہ اس کے گھنگرو بھی اٹکھیلیاں کرنے لگے۔

تانگہ اسکول سے چل کر اگلے چوک تک پہنچا اور جامع مسجد کی طرف مڑ رہا تھا کہ کچھ ہوا۔ سلطان کو محسوس ہوا کہ تانگے کے اندر سے کسی نے اس کی پیٹھ کو چھوا۔ وہ شاید ایک انگلی تھی، شہادت کی انگلی۔ نہیں۔ وہ شہادت کی انگلی کا ناخن تھا، خوبی سے تراشا ہوا ناخن۔

وہ ناخن اس کی گردن سے چلا اور ریڑھ کی ہڈی کے ایک ایک مہرے پر چڑھتا اترتا نیچے تک گیا۔ وہ گھنگرو جو گھوڑے کی گردن میں بج رہے تھے، اب تانگے کی پچھلی نشست پر بجنے لگے۔ سلطان حیران تھا کہ بارش کے دن والی ہوا اچانک گرم کیسے ہو گئی۔ وہ حیران تھا کہ اس کا تانگہ اچانک رام چندر جی کا رتھ کیسے بن گیا۔ وہ حیران تھا کہ دو رویہ مکانوں کی چھتوں پر چڑھی ہوئی عورتیں سیتا کی بِدائی کے گیت کیسے گانے لگیں اور ہوا میں گیندے کی پنکھڑیاں اور رنگے ہوئے چاول کیسے بکھرنے لگے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے باپ کا تانگہ تھا یا رام کی لیلا۔

گھوڑی سدھائی ہوئی نہ ہوتی تو ایودھیا سے اِدھر نہ رکتی۔

وہ سیدھی چوہدری صاحب کی حویلی پر پہنچی اور گردن جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ جب بہت دیر ہو گئی اور کوچوان نے اتر کر لگام نہیں تھامی تو لڑکی خود ہی اتری اور لپک کر حویلی کے در میں چلی گئی۔

وقت شاید تھم گیا یا دوڑنے لگا۔ سلطان کو اُس وقت ہوش آیا جب چوہدری صاحب کے ملازم نے در سے گردن نکال کر اس سے کہا: اب جاؤ۔ کل صبح سویرے آ جانا۔

'اب جاؤ۔' یہ دو لفظ تو شاید دو پہیوں میں تحلیل ہو گئے لیکن 'کل

صبح سویرے آجانا' کے چار لفظ گھوڑی کی ٹاپوں میں ڈھل گئے۔ اُسے گھر تک سلطان نہیں لایا۔ گھوڑی خود ہی چل کر آئی۔ سلطان نے اس شام اسے اپنے ہاتھ سے بنا کر اچھا سے چارا کھلایا، اس کی گردن میں بانہیں ڈالیں اور اس کے گال تھپتھپائے۔

اگلی صبح وہ بن سنور کر تانگے پر بیٹھا اور اب جو تانگہ بستی کی بڑی سڑک پر چلا تو راہ میں حافظ جی، قاضی جی، میر صاحب، حکیم صاحب، ڈاکٹر صاحب، مختار صاحب، ممتاز صاحب، سب ہی ملے۔

کوئی اور صبح ہوتی تو سلطان ان سب کو سلام کرتا لیکن اس صبح اس نے نرالی آواز لگائی۔ ”حافظ جی، آپ ٹھیک کہتے تھے۔ قاضی جی، آپ کا خیال صحیح تھا۔ میر صاحب، آپ کی بات صحیح نکلی۔ حکیم صاحب، آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ ڈاکٹر جمنا پرشاد، آپ کی رائے درست تھی۔ مختار صاحب، ممتاز صاحب، آپ سچے نکلے۔ مجھے نیند آتی تھی۔ میں خوب سوتا تھا۔ میں خوب سوتا تھا۔“

وہاٹ اِز یور فادر؟

کم سن جارج کو یہ بات خود اس کے باپ رحمت مسیح نے بتائی کہ وہ یوں تو شہر کی جیل میں جمعدار ہے لیکن قتل کے مجرموں کو پھانسی بھی وہی دیتا ہے۔

عام حالات میں شاید رحمت اپنے بیٹے کو یہ بات کبھی نہ بتاتا لیکن وہ جب شراب پی کر گھر آتا تھا تو صورتِ حال مختلف ہوتی تھی۔

جس روز رحمت کسی کو پھانسی لگاتا اُس دن اُسے تیس روپے ملتے تھے۔ پھر وہ گھر آنے سے پہلے چھک کر شراب پیتا اور گھر آکر پہلے تو بیوی اور بیٹے کو بری طرح مارتا اور پھر دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتا۔

یہ کچھ ایسا معمول بن گیا تھا کہ بیوی اس کی خوشامد کرتی کہ یہ دھندا بند کر دو اور یسوع مسیح کی خوشامد کرتی کہ دنیا سکھ چین سے اتنی بھر جائے کہ کبھی کسی کو پھانسی ہی نہ ہو۔

یسوع مسیح کی تو خبر نہیں لیکن جیل کے حکام نے رحمت کی ایک نہ سنی۔ اس نے لاکھ کہا کہ جلاّد کے کام کے لئے کسی اَور کو ڈھونڈ لیا جائے لیکن شاید اب کوئی جمعدار اس کام کے لئے تیار نہ تھا لہٰذا حکام نے پہلے اسے ہر پھانسی پر دس روپے، پھر بیس اور آخر تیس روپے نقد دینے شروع کئے۔

رحمت اِن تیس روپوں کی شراب پی کر اور بیوی بچے کو مار پیٹ کر تکیے میں منہ چھپا کر روتا۔

اس کا یہ رونا ایسا تھا کہ بیوی اور بچہ اپنی مار بھول جاتے تھے۔ پھر رحمت اپنی سرخ انگارہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ننھے جارج سے کہتا۔ "تیرے کو پتہ بھی ہے۔ تیرا باپ جمعدار نہیں، جلاّد ہے۔" یہ کہہ کر یا تو جارج کو مارتا یا بلک بلک کر روتا۔

جب تک جارج کا ننھا ساذہن جمعدار اور جلاّد میں تمیز نہ کرسکا، کمسن لڑکے کو صرف باپ کی مار نے ستایا، لیکن جب اس کے اسکول میں داخلے کا وقت آیا تو جارج سے پہلے رحمت کو پریشانی لاحق ہوئی۔

"لڑکے اس سے پوچھیں گے کہ تیرا باپ کیا کرتا ہے تو یہ کیا جواب دے گا؟" رحمت اپنی بیوی سے پوچھتا اور پھر خود ہی جواب دیتا۔ "جیل میں ملازم ہے۔ جیل میں نوکری ہے اس کی۔ جیل میں کام کرتا ہے۔"

بیوی کہتی۔ "اور جب لڑکے پوچھیں گے کہ جیل میں کیا کام کرتا ہے، تو؟"

رحمت پیر پٹخ کر کہتا۔ "جیل میں جھاڑو دیتا ہے۔"

بیوی کہتی۔ "نہیں۔ لڑکے اس بات پر بھی اس کا جینا حرام کردیں گے۔"

دونوں دیر تک سر کھپاتے اور یہ بات زبان پر تو نہ لاتے لیکن خود سوچ کر رہ جاتے کہ لڑکا ذہین ہے، خود ہی کوئی جواب بنالے گا۔

آخر جارج کے اسکول جانے کا دن آپہنچا۔ رحمت اسے سائیکل پر بٹھا کر لے گیا۔ اس کا خیال تھا کہ بیٹے کو اسکول کے گیٹ پر اتارے گا لیکن

کچھ سوچ کر وہ دور ہی رک گیا۔ "وہ دیکھ۔ وہ سامنے تیرے اسکول کا گیٹ ہے۔ اس کے اندر چلا جا۔"

جارج سائیکل سے اترا اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا ہوا اُدھر بڑھا۔ ایک بار اس نے ٹھہر کر اور پلٹ کر باپ کی طرف دیکھا۔ باپ نے اشارے سے کہا۔ "جا۔ جا"۔

جارج کے گلے میں پڑا ہوا لمبا سا بستہ ہر قدم پر اس کے گھٹنوں سے ٹکرا ٹکرا کر جھولتا رہا۔ باپ نے ڈرے ہوئے، سہمے ہوئے بیٹے کو اسکول میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا۔ پھر وہ کافی دیر وہیں کھڑا رہا اور آخر گھر لوٹ آیا۔

سہ پہر کو وہ جارج کو گھر لایا تو راستے بھر اس سے دنیا زمانے کی باتیں کرتا رہا۔ خدا جانے کہاں کہاں کے قصے سناتا رہا۔ دکان سے مٹھائی بھی دلوائی لیکن یہ نہیں پوچھا کہ اسکول میں کیا ہوا۔

البتہ گھر پہنچتے ہی ماں نے جارج سے پوچھا۔ "بیٹے، اسکول میں کیا ہوا؟"

رحمت نے سانس روک لی اور چاہا کہ اپنے کان بند کر لے۔ اس کا خیال تھا کہ جارج بتائے گا کہ اسکول کے لڑکوں نے اس سے پہلی بات یہی پوچھی کہ تمہارا باپ کیا کرتا ہے۔

لیکن کئی روز گزر گئے۔ جارج نے یہی نہیں بتایا۔ وہ صبح کی حمد کے بارے میں بتاتا، ڈرل کے متعلق بتاتا، پیپل اور نیم کے پتّے کی تصویر بنانے کے بارے میں بتاتا اور یہ بھی بتاتا کہ جب کسی سے اس کا نام پوچھنا ہو تو کہنا چاہیئے: وہاٹ اِز یور نیم؟

ایک روز باپ نے پوچھا۔ "رے آج تو نے اسکول میں کیا سیکھا؟"
جارج نے بتایا۔ "وہاٹ اِز یور فادر ؟"
رحمت نے پوچھا۔ "اردو میں بتا اس کا کیا مطلب ہوا۔"
جارج نے بتادیا۔ "تمہارا باپ کیا کام کرتا ہے؟"
رحمت نے وہیں بات کاٹ دی۔ "چل تجھے چڑیا گھر کی سیر کرا کے لاؤں۔"

دن گزرتے گئے۔ رحمت دعائیں مانگتا رہا کہ سوال تک تو ٹھیک ہے، اب ٹیچر اپنے اس انگریزی سوال کا جواب نہ مانگے۔"

ٹیچر نے تو نہیں مانگا۔ لڑکوں نے طلب کر لیا اور ایک روز جارج کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ "تمہارے ابّو کیا کرتے ہیں؟"

جارج ٹالتا رہا۔ کبھی کہتا، نوکری کرتے ہیں۔ کبھی کہتا، کام کرتے ہیں۔ لیکن لڑکوں کی تشفّی تو رہی ایک طرف، ان کا تجسّس بڑھتا گیا اور آخر انہوں نے جارج کو چڑانا شروع کر دیا۔ وہ سب مل کر نعرے لگاتے۔
"تمہارے ابو کیا کرتے ہیں۔"
جارج رونے لگتا۔

اور جس دن وہ روتا ہوا گھر پہنچا، اس روز اس نے ماں باپ کو اپنی بپتا بتا ہی دی۔ ماں کی آنکھ سے آنسو ٹپکا اور باپ سیدھا اپنے حکام کے پاس پہنچا اور خوشامد کرنے لگا کہ اب اسے کوئی دوسرا کام سونپا جائے۔

جیلر نے موٹی سی گالی دے کر کہا۔ "ابے جا۔ میرے کو پتہ ہے، تو ہر پھانسی کے چالیس روپے لینا چاہتا ہے۔"

وہ روپوں کو بد دعائیں دیتا ہوا واپس آگیا۔

پھر وہی ہوا۔ اس نے صبح سویرے دو مجرموں کو پھانسی دی اور ساٹھ روپے جیب میں اڑس کے سیدھا شراب کے ٹھیکے پر پہنچا۔

اُس روز اس نے بیوی اور بچے کو پہلے سے زیادہ مارا البتہ اس کے معمول میں ایک فرق آ گیا۔

اِس بار وہ رویا نہیں، نہ بلک کر، نہ پھوٹ کر اور نہ تکیے میں منہ چھپا کر۔

ایک روز یہ ہوا کہ رات کے سناٹے میں جارج سوتے سے اٹھ بیٹھا اور رونے لگا۔ ماں باپ بھی جاگ اٹھے اور پوچھنے لگے کہ کیا ہوا۔

جارج کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں۔

بڑی مشکل سے بولا۔ "وہ اسکول کے لڑکے ہیں نا۔ وہ مجھے پکڑ کر جھولے کے پاس لے گئے۔ سب نے مل کر مجھے اٹھایا اور جھولے کی رسّی میرے گلے میں باندھ کر مجھے پھانسی دے دی۔ پھر وہ سب بوڑھی عورتیں بن گئے۔ ان کے دانت ٹوٹے ہوئے تھے اور ان کے منہ کے اندر اندھیرا تھا۔ وہ سب عورتیں کالے کالے مسوڑھے نکال کر ہنسنے لگیں اور میرے چاروں طرف چکر کاٹ کر چیخنے لگیں: لاؤ ہمارے تیس روپے، لاؤ ہمارے تیس روپے۔"

ماں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔

باپ خود کو زور زور سے تھپڑ مارتا ہوا دوبارہ سونے کے لئے چلا گیا۔

اتفاق سے ان دنوں سارے کے سارے سیشن جج مستعد ہو گئے۔ انہوں نے پھانسی کی سزا کے حکم سنانے کی رفتار تیز کر دی۔ اپیلیں تیزی سے

مسترد ہونے لگیں اور رحم کی درخواستیں تمام کی تمام بے اثر ہو کر رہ گئیں۔

یہی حال جارج کی ماں کی التجاؤں کا ہوا۔ "مت مارا کر، ارے مت مارا کر، لڑکا باغی ہو جائے گا، لڑکا گھر سے نکل جائے گا۔"

ماں بہت سمجھاتی لیکن رحمت پر کوئی بات اثر نہ کرتی۔ ایک روز اس نے شوہر سے کہا۔ "اچھا، مارنے کے بعد رو لیا کر۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟" رحمت چلایا۔

"تیری مار کا اثر کم ہو جاتا ہے۔"

کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی بلکہ اب تو شراب پی کر رحمت بدکلامی کرنے لگا، گالیاں دینے لگا اور چیخ چیخ کر اعلان کرنے لگا۔ "ہاں میں پھانسی دیتا ہوں۔ اَور دوں گا۔ سسروں کو جہنم بھیجنے میں اب مجھے مزا آنے لگا ہے۔"

جارج حیرت سے آنکھیں پھاڑے باپ کی یہ باتیں سنتا رہتا۔

ایک روز رحمت کسی کو پھانسی دے کر اور شراب پی کر گھر آیا اور آتے ہی بیوی کو بری طرح مارا پیٹا۔ سہما ہوا بیٹا دیکھتا رہا۔ جب باپ اس کی ماں کو مارتے مارتے ہلکان ہو گیا تو بیٹا بولا۔ "بابا۔ پتہ ہے کیا؟"

"کیا۔"

"اب کے میں اسکول والوں کو ساری بات بتا دوں گا۔"

یہ سننا تھا کہ رحمت کمسن بیٹے پر پل پڑا اور جب تک ماں نے خود کو ان کے درمیان گرا نہیں دیا وہ بچے کو مارتا رہا۔ سارا گھر دیسی شراب کی بدبو سے اور بیٹے کی سسکیوں سے بھر گیا۔

اگلے روز اس نے دو آدمیوں کو پھانسی دی۔ وہ قران پر جھکے ہوئے تھے، انہیں اٹھایا، ان کے سروں پر سیاہ غلاف چڑھایا۔ انہیں پھانسی گھاٹ تک

لے گیا، گلے میں پھندے ڈالے اور پیروں تلے کے پٹ گرانے کے لئے پھانسی کا وہ دستہ کھینچا جس کے کھنچتے ہی ان کی لاشوں کی گردنیں بھی کھنچ گئیں۔ پھر ڈاکٹر سے ان کی ٹنگی ہوئی لاشوں کا معائنہ کرا یا، ان کے کھلے ہوئے منہ اور پھٹی ہوئی آنکھیں بند کیں اور آخر دونوں لاشیں اتار کر مردہ خانے میں ڈالیں۔

اس ساری مشقت کے بعد جب اسے ساٹھ روپے ملے تو اس کے سینے میں ایک عجب خواہش مچلی۔ اس کا دل چاہا کہ تیس روپے کے نوٹ ایک لاش کے منہ میں ٹھونس دے اور باقی تیس روپے کے نوٹ دوسری کے منہ میں۔

لیکن جیل مینوئل میں پھانسی پانے والوں کی لاشوں کی بے حرمتی کے سخت ممانعت تھی۔ البتہ جلاّد کے شراب خانے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔

جس وقت وہ گھر پہنچا، جارج نہا دھو کر، کپڑے بدل کر، گلے میں بستہ لٹکا کر اسکول جانے کے لئے گھر سے نکل رہا تھا۔ باپ نے اسے تو چھوڑا لیکن خونی بھینسے کی طرح ناک سے بھاپ اڑاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ جارج جب تک دور نہیں چلا گیا، ماں کی چیخیں اس کے کانوں کو چھیدتی رہیں۔

بال جمائے، سیدھی مانگ نکالے وہ جوں ہی اسکول میں داخل ہوا، لڑکوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا اور نعرے لگانے لگے: تمہارے لاّ کیا کرتے ہیں؟

اس روز جارج تن کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ”آج میں بتاتا ہوں کہ

میرے ابو کیا کرتے ہیں۔"

لڑکوں کو اس کی بات پر یقین نہ آیا۔ اس نے دوبارہ کہا۔ "ابھی بتاتا ہوں کہ میرے ابو کیا کرتے ہیں۔"

اس پر سارے لڑکے خاموش ہو گئے۔ شاید اس کے اگلے بیان کا انتظار کرنے لگے۔

جارج بولا۔ "لو سنو۔ میرے ابو جیل میں......"

یہاں پہنچ کر وہ رکا اور پھر بولا۔ "میرے ابو جیل میں.....وہ دیتے ہیں۔"

سارے لڑکے چلائے۔ "کیا؟؟؟؟"

جارج نے دھیمے سے کہا۔ "جھاڑو۔"

لین حاضر

غلام علی سر جانہ سیاست داں تو نہ تھے لیکن سری لنکا کے ایک جیوتشی نے بتایا تھا کہ وہ ایک روز اپنے ملک کے سربراہ بنیں گے۔
سربراہ تو وہ بعد میں بنتے، ابھی وزیر ہی بنے تھے کہ جیوتش کا علم ہانپ گیا اور اتنا ہلکان ہوا کہ غلام علی سر جانہ زیادہ عرصے وزیر بھی نہ رہ سکے۔ جوں ہی ان کے رہنما کی حکومت کا تختہ الٹا، ان کی وزارت پر بھی تختے بچھا کر مٹی ڈال دی گئی۔

بے چارے غلام علی اپنی چند ماہ کی وزارت کے دوران نہ کوئی صنعت لگا سکے، نہ کوئی لائسنس یا پرمٹ حاصل کر پائے۔ صرف ایک کوٹھی بنوائی، وہ بھی اپنی ذاتی پونجی سے۔ لہٰذا جب مخالف حکومت برسر اقتدار آئی اور تمام سابق وزیروں سفیروں کے خلاف مقدمے قائم ہونے لگے تو غلام علی سر جانہ کے خلاف بھی تفتیش شروع ہوئی۔

کریم نگر کے تھانے کے انچارج کو اوپر سے حکم آیا۔ ”حرام زادے کے خلاف کیس بناؤ۔“

اب وہ بے چارے کچھ اتنے حرام زادے بھی نہ تھے۔ ان کے باپ نہ صرف نہایت معزز شہری اور تاجر بلکہ بہت مودب شاعر بھی تھے۔

تھانے کا انچارج تھک ہار کر بیٹھ رہا۔

اوپر سے حکم آیا کہ غلام علی کے بریف کیس سے اسلحہ نکالو، تھیلے سے منشیات برآمد کرو، آتش زنی کا مقدمہ بناؤ، بھینس کی چوری میں ملوث کرو۔ مگر وہ بے چارے اتنے شریف النفس تھے کہ ایک روز تو تھانے کا انچارج اپنی بے بسی پر رونے لگا۔

تب اس کے ایک زیرک پرچہ نویس نے اس کے کان میں بڑے پتے کی بات کہی۔ اگلے ہی روز غلام علی سرجانہ کے خلاف خدا جانے کون سی تعزیرات کی اللہ جانے کون سی دفعہ کے تحت مقدمہ قائم ہو گیا۔

اعلان ہوا کہ سابق وزیر نے اپنا جو 'محل' تعمیر کرایا اس کے سارے دروازے، کھڑکیاں اور ان کے چوکھٹے اندرون سندھ کسی قدیم عمارت سے نکال کر لگائے گئے ہیں جو تاریخی یادگاروں کے تحفظ کے قانون کی صریح خلاف ورزی ہے لہٰذا علاقے کی پولس حرکت میں آگئی ہے اور سابق وزیر کو یا تو کولہو میں پلوادیا جائے گا یا توپ دم کیا جائے گا کیونکہ اس سے زیادہ سنگین جرم تو اس سرزمین پر آج تک سرزد ہی نہیں ہوا تھا۔

اوپر کے حکام نے تھانے کے انچارج کی پیٹھ ٹھونکی، اسے ایک تمغہ دیا اور کچھ نقد انعام بھی دیا اور کارروائی جاری رکھنے کا پروانہ جاری کر دیا۔

اگلے روز غریب انچارج پولیس کی کچھ نفری اور بڑے بڑے تختے اور لمبی چوڑی میخیں لے کر غلام علی سرجانہ کی کوٹھی پر پہنچا اور نہایت مستعدی سے تمام کھڑکیوں اور دروازوں پر تختے اتنی مضبوطی سے ٹھونک دیئے کہ کسی راہ سے کسی مکھی کا بھی گزر ہونے نہ پائے اور کسی مکڑے کی کُٹیا کی بھی قسمت جاگنے نہ پائے۔

شام کو تھانہ انچارج نے اوپر والے بڑے صاحب کو ٹیلی فون کیا، پہلے کھڑے ہو کر سلوٹ کیا، پھر یہ مژدہ سنایا کہ غلام علی سر جانہ کا 'محل' تختے ٹھونک کر سر بمہر کر دیا گیا ہے۔

انچارج سمجھا کہ ایک بار پھر اس کی پیٹھ ٹھونکی جائے گی۔

بڑے صاحب نے پوچھا۔ "جب تختے ٹھونکے گئے اس وقت غلام علی سر جانہ گھر کے اندر تھا؟"

"نہیں سر، وہ تو باہر گیا ہوا تھا۔"

تو گویا وہ بھوکا پیاسا نہیں مرے گا۔

تھانہ انچارج کو وہیں معطل کر کے لین حاضر ہونے کا حکم دے دیا گیا اور کچھ روز بعد اسے محرر بنا کر مکران کے اس علاقے میں بھیج دیا گیا جہاں سکندر اعظم کی فوجیں پیاسی مر گئی تھیں۔

رضا علی عابدی
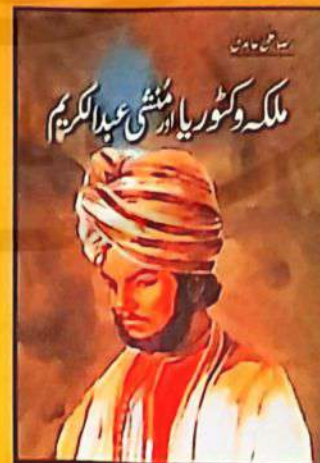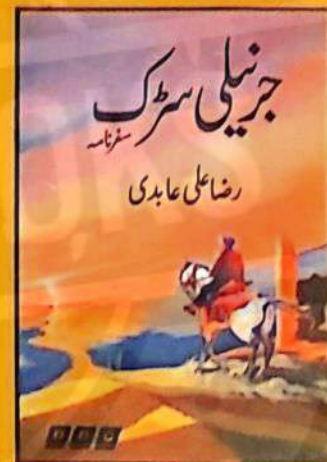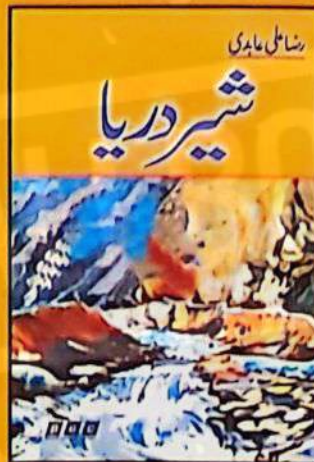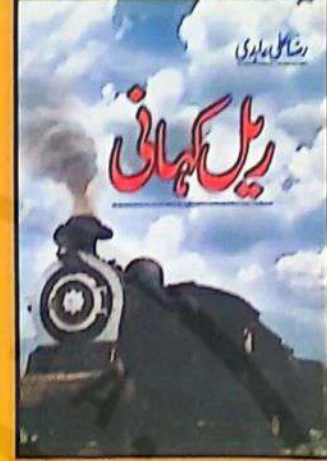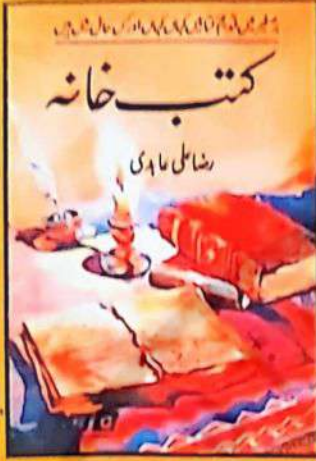
Rs. 400-00

www.sang-e-meel.com
ISBN-10:969-35-1032-1
ISBN-13:978-969-35-1032-4
9789693510324
www.sang-e-meel.net